دارالآخرة

مؤلف

آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب

مکتب اہل البیتؑ

رضویہ سوسائٹی

વકફ

આ કિતાબ હાજી મહંમદઅલી ભાઈ અલીભાઈ સુંદરજી "સોમાસોક" તનનારીવ માડાગાસ્કરવાળા તરફથી તેમના મરહુમ સગાંવહાલાંઓની રૂહોના સવાબ અર્થે વકફ કરવામાં આવેલ છે.

લાભ લેનાર ભાઈ - બહેનો મરહુમોની અરવાહોના સવાબ અર્થે એક સુરએ ફાતેહા પઢી બક્ષી આપે એવી નમ્ર અરજ છે.

دارُ الآخرۃ

(حصہ دوّم)

تالیف

شہید محراب آیت اللہ سید عبدالحسین شیرازی

مترجم

سید حسنین عباس رضوی

ناشر

مکتب اہل البیتؑ سی ۱۲ ؍ رضویہ سوسائٹی کراچی

نام کتاب:۔	دارالآخرہ جلد دوم
مترجم:۔	سید حسنین عباس رضوی
نظر ثانی:۔	سید محمد تقی مکتبی
کمپوزنگ:۔	ابو رضا ہندی
تاریخ طباعت:۔	ماہ محرم ۱۴۲۴ھ بمطابق مارچ ۲۰۰۳
تعداد اشاعت:۔	ایک ہزار
ھدیہ:۔	۷۵/= روپے
مطبع:۔	الہدیٰ پرنٹرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

محترم قارئین۔۔۔السلام علیکم

ادارہ کی طرف سے آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب شہید محراب کی کتاب برائے دیگر کا اردو ترجمہ دارالآخرۃ کی دوسری جلد کی صورت میں پیش خدمت ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ شہید آیت اللہ دستغیب کے آثار بلاشبہ ایک قیمتی اثاثہ ہیں اور ادارہ مکتب اہل بیت نے اس اثاثے کو اردو زبان میں بھی محفوظ رکھنے کی سعی کی ہے تاکہ اردو فہم حضرات بھی اس خزانے سے بہرہ مند ہو سکیں۔

ادارہ محترم جناب سید محمد حسنین رضوی صاحب کا بے حد ممنون ہے کہ انہوں نے اپنی تعلیمی مصروفیات کے باوجود قیمتی وقت نکال کر اس کتاب کا ترجمہ کیا اور ہم دعا گو ہیں کہ خداوند متعال ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

مومنین کرام ترجمہ میں انتہائی جانفشانی اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے کہ زبان وبیان میں کوئی خامی نہ رہ جائے لیکن پھر بھی صاحب نظر حضرات کی جانب سے کسی قسم کی

خامی کی نشاندہی کو ادارہ اپنے لئے اصلاحی مشورہ جانتے ہوئے آئندہ کی اشاعت میں بہتری کے لئے معاون شمار کرے گا۔ ادارہ امید کرتا ہے کہ یہ کتاب بھی مومنین کرام کی روحانی تسکین کا ذریعہ قرار پائے گی۔

ہم کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اہل علم حضرات کے تہہ دل سے مشکور و ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری مدد کی خصوصاً مولانا سید تقی نقوی صاحب کہ جنہوں نے کتاب کی تصحیح فرمائی۔

آخر میں ہم دعا گو ہیں کہ خداوند متعال ہماری اس سعی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے (آمین)

ناشر مکتب اہل بیت 12/c رضویہ سوسائٹی کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

مکتب اہلبیت گذشتہ ۲۰ سالوں سے دینی تبلیغاتی ادارے کی حیثیت سے کام کر رہا ہے اس ادارے کے تحت بچوں کی دینی تعلیم و تربیت، نماز کی عملی مشق، دینی امتحانات کا انعقاد اور نوجوانوں کو تعلیمات محمدؐ و آل محمدؐ سے روشناس کرانے کے لئے کتب اور کیسٹ لائبریری کا قیام اور جید علماء کرام کے ہفتہ وار درس اخلاق و مسائل فقہ جو ہر جمعہ کو بعد نماز مغرب وعشاء پابندی کے ساتھ منعقد کیا جاتا ہے جس میں علاقے کے مومنین کافی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔

چہاردہ معصومین کے ایام ولادت وشہادت کے موقع پر محافل و مجالس کا انعقاد کیا جاتا ہے ادارہ اپنے اخراجات کو پورا کرنے اور اپنے آپ کو خود کفیل بنانے کے لئے مختلف دینی اور اخلاقی موضوعات کی کتب فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کرا کے شائع کرتا رہتا ہے اور یہ کتاب جو کہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس سے قبل ادارہ، آیت اللہ دستغیبؒ کی معرکۃ الآراء کتاب گناہ کبیرہ (۲ جلدوں میں) ترجمہ

کرا کے شائع کر چکا ہے جس کو مومنین نے بے حد سراہا اور اس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہوئے لیکن ہمیشہ نایاب رہی۔

مومنین کرام کا تعاون رہا تو ادارہ پر امید ہے کہ مذید دینی و تبلیغی خدمات انجام دیتا رہے گا۔

دعا گو ہیں کہ خداوند متعال کے حضور ہماری کاوش مقبول ہو اور آئمہ طاہرین خشنود ہوں۔۔۔۔۔والسلام

مکتب اہل بیت۔ سی ۱۲ رضویہ سوسائٹی کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

درس (۳۲)

درس (۳۳)

درس (۳۴)

درس (۳۵)

درس (۳۶)

درس (۳۷)

درس (۳۸)

درس (۳۹)

درس (۴۰)

درس (۴۱)

درس (۴۲)

درس (۴۳)

درس (۴۴)

درس (۴۵)

درس (۴۶)

درس (۴۷)

درس (۴۸)

درس (۴۹)

درس (۵۰)

درس (۵۱)

درس (۵۲)

درس (۳۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَشَارِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ فَشَارِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ﴾

''جہنمی لوگ کھولتے پانی کو پئیں گے پس یہ لوگ پیاسے اونٹ کی مانند پئیں گے یہ قیامت کے دن کی پہلی پذیرائی ہوگی ہم نے تمہیں خلق کیا ہے پھر اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے۔''

ہماری گفتگو اس آیت کے ضمن میں ہو رہی تھی کہ جہنمی لوگ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر جہنمی زقوم (ایک قسم کا درخت جو بہت ہی تلخ اور گرم ہوگا) کو کھانے لگیں گے اور یہ اتنا گرم ہوگا (فقطع امعائهم) کہ ان کی آنتوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ جبکہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ جہنم کے مامورین یعنی فرشتے انہیں اس درخت کے کھانے پر مجبور کریں گے۔

زقوم کے کھاتے ہی یہ ان کے پیٹ میں ابلنا شروع ہو جائے گا اور پیاس کی اتنی شدت ہوگی کہ وہ واعطشا (ہائے پیاس) کی صدائیں بلند کرنے لگیں گے اور وہ درد کی شدت سے مالک دوزخ سے پناہ مانگیں گے تو مالک دوزخ انہیں حمیم (گرم پانی) کی طرف اشارہ کرے گا جو کہ جہنم میں جاری ہوگا۔

فَشَارِبُونَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیمِ اس وقت جہنمی لوگ حمیم (گرم پانی) کو پینے لگیں گے اور جیسے ہی وہ لوگ اس پانی کو اپنے منہ کے نزدیک لے جائیں گے پانی کی گرمی سے انکے چہرے کا گوشت کٹ کٹ کر گرنے لگے گا لیکن اس کے باوجود وہ اس کو پئیں گے۔

جہنمی لوگ پیاسے اونٹوں کی مانند اس کو پئیں گے

﴿فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِیمِ﴾

پس یہ لوگ ھیم کی مانند اس کو پئیں گے۔ عربی زبان میں ھیم کا لفظ اونٹوں کی ایک خاص قسم کی بیماری کے لئے بولا جاتا ہے، ھیم کا لفظ اصل میں ھیام اور اس کی صفت اھیم آتی ہے اس بیماری کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں مبتلا اونٹ پیاس کی شدت سے تڑپنے لگتا ہے اور اس قدر پانی پیتا ہے کے اس کی موت زیادہ پانی پینے کی وجہ سے واقع ہو جاتی ہے، اونٹ جو کہ پیاس کو برداشت کرنے میں دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے دو ہفتے بلکہ شاید ۱۸ دنوں تک اپنی پیاس کو برداشت کر سکتا ہے اس قدر صبر کا مظاہرہ کرتے کے باوجود اگر اسے ھیم کی بیماری لگ جائے تو

کثرت سے پانی پینے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔

اب اگر مندرجہ بالا آیت میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پروردگار جہنمیوں کی پیاس کو اونٹوں کی مخصوص بیماری ھیم کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ اے جھوٹے لوگو تمہارے گناہوں کی سزا یہ ہوگی کہ تم لوگ ان اونٹوں کی مانند جہنم کے کھولتے پانی کو پیو گے جسے ھیم (پانی پینے) کی بیماری لگ چکی ہو۔

انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ جب بھی کسی تلخ یا گرم چیز کو چکھتا ہے تو فوراً اسے چھوڑ دیتا ہے لیکن یہ جہنمی لوگ زقوم (تلخ قسم کا درخت) کو کھائیں گے اور حمیم (کھولتے پانی) کو پئیں گے اور اس قدر پئیں گے کہ ان کی آنتیں کٹ کٹ کر گر جائیں گی اسی طرح یہ مرتے اور زندہ ہوتے رہیں گے۔

پہلی مہمان نوازی زقوم اور حمیم کے ساتھ

﴿هَذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّینِ﴾

"آج کے دن کی پہلی پذیرائی"

نزل کے معنی پہلی مگر مختصر پذیرائی کے ہیں عام طور سے جب کوئی مہمان کسی کے گھر میں وارد ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کی مختصر سی خاطر تواضع کی جاتی ہے جو اکثر اوقات چائے یا شربت پر مشتمل ہوتی ہے اس کے بعد پھر مکمل طور سے خاطر تواضع اور مہمان نوازی کی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا آیت ﴿هَذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّینِ﴾ میں خداوند کریم ارشاد

فرمارہا ہے کہ جہنمیوں کی پہلی خاطر تواضع (سزا) زقوم (تلخ درخت) اور حمیم (کھولتے پانی) سے کی جائے گی اور بڑے بڑے عذاب بعد میں دیئے جائیں گے اس آیت میں اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ جہنم والوں کو اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کیوں کہ جہنمی اپنی انسانی صورتیں کھو کر حیوانی صورتیں اختیار کرلیں گے اور ان کے باطن بھی ان کے ظاہر کی طرح ہو جائیں گے جس طرح روایت میں بھی آیا ہے کہ جہنمی ایسی شکلوں میں ظاہر ہوں گے جنہیں دیکھ کر وہ بندروں اور سوروں کو بھی خوبصورت محسوس کریں گے (۱) قرآن کریم میں بھی انسانی اور جناتی شیطانوں کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے بلکہ انسانی شیطانوں کو جناتی شیطانوں سے پہلے ذکر کیا گیا ہے (۲) اور ظاہری روایت کے مطابق ان کی شکلیں انسانوں کی مانند مگر دل شیطانوں کی طرح کے ہوں گے (۳)

خلاصہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید اونٹ سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ لوگ حیوانی خاصیتوں سے بلند ہو کر انسانی منزلت تک نہ پہنچ سکے۔

جانوروں کی طرح جہنمیوں کے بھی مالک ہوں گے

جس طرح حیوانوں کا کوئی مالک ہوا کرتا ہے مثال کے طور سے بھیڑ، بکریوں اور دیگر حیوانوں کا کوئی نہ کوئی مالک ہوتا ہے اسی طرح دوزخ والوں کے بھی مالک ہوں گے کیوں کہ حقیقت میں یہ بھی جانور ہی ہیں اس لئے ان کے بھی مالک ہوں گے (جو انہیں عذاب کے مزے چکھائیں گے) روایت میں آیا ہے کہ جہنمی لوگ

---

(۱) عین الیقین فیض (۲) سورۂ ۲ آیت ۱۱۲ (۳) سفینۃ البحار ج ۱ ص ۵۵۲

کتوں کی طرح بھونکیں گے (۱)۔

خداوند کریم مندرجہ ذیل آیت میں ارشاد فرماتا ہے کہ

﴿نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ﴾ "ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے تو پھر (اس بات کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے؟"

گزشتہ آیات میں پروردگار نے منکرین کے لئے عذاب کا ذکر کیا ہے جبکہ اس آیت میں قیامت کے جسمانی ہونے پر دلیل دی جارہی ہے اور اس آیت پر صرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جس کے بعد انسان ساری باتیں خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہ دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے قیامت کا انکار کرنے والوں کو بتایا جائے کہ کس نے انہیں پیدا کیا ہے کیا انہوں نے خود اپنے آپکو پیدا کیا ہے؟ جس شخص کے پاس ذرا بھی عقل ہو وہ سمجھ جائے گا کہ وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے، اسکا وجود ابھی ہے لیکن پہلے نہ تھا کیا یہ عجیب وغریب نظام جو کہ انسانی بدن میں موجود ہے یہ خود بخود وجود میں آیا ہے یا اس کا کوئی خالق اور صانع ہے؟

انسانی بدن میں تقریباً ۲۰۶ ہڈیاں موجود ہیں جو کہ باہم ترتیب کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں اگر ان میں سے ایک ہڈی بھی کم کردی جائے تو بدن ناقص ہوجائے گا۔

انسانی ہاتھ میں ۳۳ ہڈیاں موجود ہیں اگر ایک ہڈی بھی نکال لی جائے تو انسانی ہاتھ صحیح سے حرکت نہیں کرسکتا یہ باتیں تو ہم نے صرف بطور مثال بیان کیں (۱)

سورۂ ۲۳ آیت ۱۰۹

ہیں مگر تمام انسانی اعضاء و جوارح اپنی مثال آپ ہیں جسم کی باریک سی باریک رگوں سے لے کر معدہ، جگر، دل اور اعصابی نظام یہ سب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ انہیں بنایا گیا ہے یہ خود سے نہیں بنے اور جب تمھارا خالق موجود ہے جس نے تمہیں پہلی مرتبہ خلق کیا ہے (جب تم کچھ نہ تھے) تو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ تمہیں دوبارہ خلق کر سکے بے شک وہ ہر شے پر قادر ہے۔

اپنے کردار اور گفتار کے ذریعے سے تصدیق کرو

﴿فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ﴾ پھر تصدیق کیوں نہیں کرتے؟

بعض مفسرین نے ﴿فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ﴾ کی تفسیر فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ بِالْقَوْلِ وَ الْعَمَلِ کے ذریعہ سے کی ہے اور اس طرح سے معنی بیان کیے ہیں کہ (تو پھر اپنی زبان اور اپنے عمل کے ذریعے سے اس بات کی تصدیق کیوں نہیں کرتے کہ تمہارا خالق اور مالک موجود ہے صرف زبان سے تصدیق کر دینا کافی نہیں) کیوں کہ اگر کوئی شخص زبان سے اقرار کرے لیکن عمل سے اس کو ثابت نہ کرے تو وہ زبان کا سچا لیکن عمل کا جھوٹا کہلائے گا۔

مفرد کے بجائے جمع کا ذکر

اس آیت میں خاص بات یہ ہے کہ پروردگار نے نَحْنُ (ہم) کا لفظ استعمال کیا ہے جو کہ جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

جب کہ پروردگار کی ذات واحد و لاشریک ہے اور ہم جانتے ہیں کہ واحد کے لئے انا (میں) کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو پھر پروردگار نے ﴿نَحْنُ﴾ (ہم) کا لفظ استعمال کیوں کیا؟ اس بات کے بہت سارے جوابات ہو سکتے ہیں ذیل میں ہم چند ایک کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

جب بھی پروردگار اپنی ذات کو بیان کرتا ہے تو انا (میں) کا لفظ استعمال کرتا ہے جیسے ﴿انی انا اللہ﴾ کہ میں ہی اللہ ہوں اور جب خلقت یا صنعت کی طرف اشارہ کرنا ہو تو نحن (ہم) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

انسانی خلقت میں فرشتے پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں مثلاً ماں کے پیٹ میں موجود بچے کی صورت فرشتے بناتے ہیں اسی طرح ایک فرشتہ مامور ہے تاکہ وہ بچے کے مقدرات اور نصیب کو لکھے، بچے کو پیدائش کے وقت شکم مادر سے باہر نکالنے کے لئے بھی ایک فرشتہ مامور ہے خلاصہ کے طور پر فرشتے خالق کائنات کی کبریائی کے مظہر ہیں اور چونکہ انسانی خلقت میں تمام امور فرشتوں کے ذریعہ سے انجام پاتے ہیں شاید اسی وجہ سے پروردگار نے ﴿نَحْنُ﴾ (ہم) کا لفظ استعمال کیا ہے اور فرمایا ﴿أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾ ہم (تمہارے) خالق ہیں۔

مندرجہ آیت میں چونکہ خلقت کا بیان ہے اس وجہ سے لفظ (ہم) کا استعمال کیا ہے۔

دنیاوی مثال میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بادشاہ کسی شہر کو فتح کرنے کے لئے اپنی فوج بھیجتا ہے اور بادشاہ کی فوج جب مطلوبہ شہر کو فتح کر لیتی ہے تو بادشاہ کہتا

ہے کہ اس شہر کو ہم نے فتح کیا کیوں کہ شہر اس کے حکم سے فتح کیا گیا۔

اس وقت کو یاد کرو جب تم نطفہ کی حالت میں تھے

﴿ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ ﴾

کیا تم نے دیکھا اس نطفے کو جسے تم (رحم) میں ڈالتے ہو کیا تم نے اسے خلق کیا ہے یا ہم اس کے خلق کرنے والے ہیں؟

اگر تمہیں اپنے مخلوق ہونے میں شک ہو تو اپنی پہلی والی حالت (نطفہ) کی طرف ذرا غور کرو تم کیا تھے؟ صرف پانی کا ایک قطرہ کہ جس کے اجزا ءباہم متصل تھے اور اگر زمین پر ڈال دیا جاتا تو پھیل جاتا اسی ناچیز سے پروردگار نے کتنی عجیب خلقت کی ہے اور اسی سے ہڈیاں وگوشت، ظاہری اور باطنی حواس بنائے ہیں۔

ماں کے اٹھنے بیٹھنے اور حرکت کرنے کے باوجود یہ (نطفہ) رحم مادر سے خارج نہیں ہوتا اور اس جاذبہ کی وجہ سے جو کہ رحم کو عطا کیا گیا ہے بالکل درمیان ﴿فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ﴾ میں رکا رہتا ہے اور رحم کی حرارت میں پروان چڑھتا رہتا ہے۔

﴿ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ﴾

کیا تم نے اسے خلق کیا ہے یا ہم اس کے خلق کرنے والے ہیں؟

کیا تم نے اسے ظلمات ثلاثہ (تین تاریکیوں) صلب، رحم اور شکم سے باہر نکالا ہے یا ہم نے اسے باہر نکالا ہے اور یہ زیبائی جو کہ چشم اور ابرو کی وجہ سے ہیں تم نے خلق کیں ہیں اور یہ آنکھ، کان اور ناک کے سوراخوں کو کس نے حلق میں جگہ عطا

کی؟ کیا تم ایسا کرنے والے ہو یا ہم نے ایسا کیا ہے؟

سجدے کی دعا میں نعمت کا ذکر

مستحب ہے کہ جب مومن سجدے میں جائے تو سجدے کا ذکر پڑھنے سے قبل اس دعا کو پڑھے۔

﴿اَللّٰھُمَّ لَکَ سَجَدْتُ وَلَکَ اَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ سَجَدَ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَ وَ شَقَّ سَمْعَہٗ وَ بَصَرَہٗ تَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

"یعنی اے پروردگار میں نے تیرے لئے سجدہ کیا اور تیرے لئے سر تسلیم خم کیا اور تجھ پہ ایمان لایا اور اپنا چہرہ خاک پر رکھا اس ذات کے لئے جس نے اس (چہرے) کو خلق کیا اور اس میں آنکھ اور کان کے لئے سوراخ بنایا اور برتر ہے وہ پروردگار جو بہترین خلق کرنے والا ہے اور تمام تعریفیں اس پروردگار کے لئے جو تمام کائنات کا پالنے والا ہے۔"

اگر واجب نمازوں میں نہ پڑھ سکے تو اس دعا کو نافلہ نمازوں میں ترک نہ کرے اور اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو یاد کرے واقعی ان نعمتوں کی قدر اس سے معلوم کی جائے جو ان نعمتوں سے محروم ہیں۔

اس دعا کو پڑھنے کے بعد پھر سجدے کے ذکر کو پڑھے (سبحٰن ربی الاعلیٰ و بحمدہ)

ہڈیوں کے درمیان موجود چربی روغن کاری کا کام کرتی ہے۔

پاؤں کی ہڈی بدن کی مضبوط ترین ہڈیوں میں سے ایک ہے کیوں کہ تمام بدن کا بوجھ اسی ہڈی پر ہوتا ہے اور اس سے بھی عجیب بات یہ کہ اس میں موجود چربی تیل (greasy) کا کام کرتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی مشین کے پرزے مسلسل رگڑ کھانے کی وجہ سے پرانے (یا یوں ہی رکھے رکھے زنگ آلود) ہو جائیں تو ان میں تیل ڈال کر دوبارہ سے کار آمد بنایا جاتا ہے اور یہ پرزے دوبارہ آسانی سے کام کرنے لگتے ہیں۔

خداوند کریم نے بھی انسانی ہڈیوں میں جو کہ دائمی حرکت میں رہتی ہیں روغن کاری کا انتظام کر رکھا ہے ہڈیوں کے بالکل بیچ میں سوراخ موجود ہے جس میں چربی کا ذخیرہ موجود ہے یہ چربی بہت سے کام انجام دیتی ہے ان میں سے ایک کام، اعضاء کے درمیان ملائمت ایجاد کرنا ہے انسانی جسم کے وہ اعضاء جو کہ ایک دوسرے سے باہم متصل ہیں ایک دوسرے سے رگڑ کھاتے رہتے ہیں یہاں اعضاء کے درمیان نرمی پیدا کرتی ہے تاکہ انسانی اعضاء آسانی سے حرکت کرتے رہیں اور انسان آسانی کے ساتھ رکوع کر سکے، سجدے میں جا سکے واقعی جب تک کہ بدن صحیح اور سالم ہے اس سے کما حقہ استفادہ کریں۔

نطفے (sperms) کے بارے میں فخر الدین رازی کا بیان

فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروردگار نے قرآن مجید میں تقریباً ستر (۷۰) مقامات پر نطفے کا ذکر کیا ہے اور ہر دفعہ اس کی خاصیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان خاصیتوں میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ انسان اپنے کو خداوند متعال کے سامنے بالکل عاجز سمجھے اور یہ کہے کہ میں وہی نطفہ اول ہوں جو کہ جمادات کی شکل میں تھا جس میں نہ تو علم و دانش تھی اور نہ طاقت و توانائی اور آخر میں ایک مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو جاؤں گا تو پھر خدائے بزرگ کی پیروی کیوں نہیں کرتا؟

واقعی اگر کوئی اپنے اول اور آخر کے بارے میں غور کرے اور کبھی اسے فراموش نہ کرے تو کبھی بھی اس سے گناہ سرزد نہ ہو اور غرور، تکبر، حسد اور لالچ کا کہیں دور دور تک پتہ نہ چلے۔

درس (۳۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ﴾

''کیا تم نے دیکھا اس نطفے کو جسے تم (رحم) میں ڈالتے ہو کیا تم نے اسے خلق کیا ہے یا ہم اس کے خلق کرنے والے ہیں؟ اور ہم ہیں جس نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کر دیا ہے اور ہم (ایسا کرنے سے) عاجز نہیں ہیں۔''

اگر تم خدا کی مخلوق ہو تو جان لو کہ قیامت بھی ہے

قیامت کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ تم خدا کی مخلوق ہو یعنی اگر کوئی یقین کر لے کہ وہ خدا کا بندہ ہے تو پھر اسے قیامت کے بارے میں بھی یقین کرنا ہوگا کیوں کہ جب پروردگار ایک قطرے سے اتنے بڑے انسانی وجود کو خلق کر سکتا ہے تو پھر وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے۔

تمام انبیاء بھی اسی بات (مبداء اور معاد) کی تبلیغ کیا کرتے تھے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک بعض لوگ اپنے آپ کو خدا کی مخلوق نہیں سمجھتے اور ابھی تک شک میں مبتلاء ہیں اگر انصاف کے ساتھ ان دو آیتوں کی تلاوت کر لیں تو بغیر کسی شک اور شبہ کے وہ اپنے آپ کو اور دوسروں کو خدا کی مخلوق سمجھیں گے۔

﴿أَفَرَءَيْتُم مَّا تُمْنُونَ﴾

کیا تم نے دیکھا اس نطفے کو جو تم (رحم) میں ڈالتے ہو (یعنی کیا تم نے اس قطرے کو دیکھا ہے جو تمھاری خلقت کا سبب بنا ہے۔

﴿ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾

کیا تم نے اسے بنایا ہے یا ہم اس کے خلق کرنے والے ہیں۔

اگر کوئی ناسمجھ یہ کہے کہ یہ قطرہ خود بخود وجود میں آگیا ہے تو کوئی بھی عقلمند اس بات کو قبول نہیں کرے گا۔

اگر کوئی شخص کسی کوزے کے بارے میں کہے کہ مٹی جمع ہوئی پھر بارش ہوئی اور سورج نے اسے خشک کر دیا تو اس طرح سے یہ کوزہ بن گیا تو کیا کوئی عقلمند آدمی اس بات کو قبول کرے گا؟ ہرگز نہیں، کوئی قبول نہیں کرے گا بلکہ سب یہی کہیں گے کہ کسی بنانے والے نے اسے کسی خاص غرض سے بنایا ہے یہ خود سے وجود میں نہیں آیا۔

جب لوگ اس ایک کوزے کے بارے میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ یہ خود سے وجود میں آیا ہے تو یہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ ایک نطفے سے

خود بخود انسان وجود میں آسکتا ہے۔

طبیعت اور انتخاب میں فرق ہے

دل کی باریک رگوں سے لے کر بڑی بڑی شریانوں تک، جگر، معدہ آنت، کان اور اسی طرح تمام ظاہری اور باطنی حواس قوت واہمہ، قوت خیال قوت مفکرہ اور قوت حافظہ کیا یہ خود بخود وجود میں آگئے ہیں ؟ اور کیا ایک نطفہ جو کہ خود شعور سے خالی ہے ایک شعور یافتہ انسان کو خلق کر سکتا ہے۔

نطفہ جب خود شعور سے خالی ہو تو کس طرح سے کسی ایسی چیز کو بنا سکتا ہے جو کہ شعور رکھتی ہو۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ طبیعت اور مادہ (maters) کا انتخاب ہے یعنی طبیعت نے اس طرح سے خلق کر دیا ہے دوسری جانب یہی لوگ کہتے ہیں کے طبیعت (مادہ) کے پاس شعور نہیں ہے جب کہ انتخاب کے لئے شعور کی ضرورت ہوتی ہے تو پھر ایک بے شعور چیز کس طرح سے ایک شعور والی چیز کو خلق کر سکتی ہے کیا ان کی دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے؟

کیا ماں باپ بچے پیدا کرتے ہیں؟

(عام طور سے) ماں باپ کو بچے کی پیدائش (ٹھہرنے) کا پتہ تک نہیں ہوتا تو کیا خالق بھی ایسا ہوتا ہے جسے مخلوق کے بارے میں علم نہ ہو؟

﴿أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ﴾

"یا ہم خلق کرنے والے ہیں" اور قدرت ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم نطفے کو مختلف حالتوں میں گھماتے اور تبدیل کرتے ہیں تا کہ بشر تکمیل کے مراحل طے کر لے۔

یہ تھا بیان کہ ہمارا خالق اللہ تعالی ہے، جس نے ہمیں خلق کیا ہے اور اگر ہم مندرجہ بالا آیتوں پر غور کرلیں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ہم سب خدا کی مخلوق ہیں۔

موت، مخلوق ہونے کی دلیل ہے

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ﴾

ہم ہیں جس نے تمھارے لئے موت کو مقرر کیا۔

اگر تم مخلوق نہیں ہو (اور تمہیں کسی نے پیدا نہیں کیا ہے) تو پھر تمہارا خالق بھی کوئی نہیں ہوگا اور پھر تمہیں موت بھی نہیں آنی چاہئے اور تمہارا پروردگار بھی کوئی نہیں ہونا چاہئے، اب کیا تم اپنی موت کو دور کر سکتے ہو نہیں ہرگز نہیں جب تم موت کو دور نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مخلوق ہو خالق نہیں ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں پروردگار فرماتا ہے کہ ۔

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ﴾

"یعنی ہم نے موت کو تمہارے درمیان مقسم کر دیا ہے" مقسم کا مطلب تقسیم کرنا، حد بندی کرنا ہے پس اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کر دیا ہے اب کوئی جوانی میں مرجاتا ہے، کوئی بچپن میں تو کوئی

بڑھاپے میں اور کسی کو اختیار نہیں کہ وہ اپنی موت کو ٹال سکے (غرض یہ کہ ہر ایک کو مرنا ہے)، زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے لیکن آج تک کوئی اپنی یا دوسرے کی موت کو ٹال نہ سکا یہاں تک کہ بڑے بڑے بادشاہ جو کہ اپنی صحت کا بھرپور خیال رکھتے تھے اپنی موت کو ایک گھنٹے کے لئے بھی مؤخر نہ کر سکے یہاں پر ایک بات ناگفتہ بہ نہ رہ جائے کہ موت کی دو قسمیں ہیں ایک موت جو کہ مشروط اور معلق ہوتی ہے یہ ایسی موت ہوتی ہے جو کہ صدقہ سے دور ہو جاتی ہے اور رشتے داروں سے صلہ رحمی کرنے سے۔ اسی طرح مندرجہ بالا امور کے انجام نہ دینے سے موت آ جاتی ہے اسی طرح والدین کے عاق کر دینے سے بھی موت آ جاتی ہے اسی طرح بعض گناہوں کے سبب بھی انسانی عمر کم ہو جاتی ہے واضح رہے کہ یہ تمام باتیں موت کی پہلی قسم غیر حتمی موت یا مشروط موت کے بارے میں تھی جب کہ ہماری بحث حتمی موت کے بارے میں ہے جو کہ ناقابلِ تاخیر ہے۔

اسی موت کے بارے میں امام صادقؑ کی حدیث ہے کہ غیر طبیعی موت (موتِ غیر حتمی) سے مرنے والے طبیعی موت (موتِ حتمی) کی نسبت زیادہ ہیں، اور اس موت میں نہ جلدی کی جا سکتی ہے اور نہ تاخیر کی جا سکتی ہے۔

ایک ہفتہ قبل غرق ہونے والا بچ جائے لیکن۔۔۔

محدث جزائری انوار النعمانیہ میں فرماتے ہیں ایک روز میں سمندری سفر

کر رہا تھا اور ساتھ میں بادبان کے ساتھ محوِ گفتگو تھا اسی اثناء میں بادبان نے مجھے اپنے سفر کا عجیب و غریب واقعہ سنایا واقعہ کچھ اسطرح سے تھا بادبان کہتا ہے کہ ایک سفر کے دوران کسی مسافر کو رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ اس غرض سے اس سمت گیا جہاں پر اس کا انتظام کیا گیا تھا (عام طور سے یہ جگہ کنارے میں بنائی جاتی تھی) اتفاق سے اسی لمحے اتنی تیز ہوا چلی کہ وہ مسافر سنبھل نہ سکا اور سمندر میں گر گیا میں نے اپنے شاگردوں سے کہا جو کہ غوطہ خوری میں کافی مہارت رکھتے تھے تم میں سے کوئی ایک جائے اور اس مسافر کو سمندر سے نکالے ایک شاگرد سمندر میں کود گیا اور مسافر کو نکال لایا ہم نے اسے تولیہ کے ذریعہ سے خشک اور گرم کیا تاکہ اس کی حالت بہتر ہو سکے کافی دیر کے بعد جب اس کی حالت بہتر ہو گئی تو ہم نے اس کے سر کو اوپر کی جانب اٹھایا تو ہم نے دیکھا کہ یہ تو وہ مسافر نہیں ہے جو کہ ہماری کشتی سے سمندر میں گرا تھا بلکہ یہ کوئی اور ہے ہم نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے تو اس نے بتایا کہ ایک ہفتہ قبل اس کی کشتی غرق ہو گئی تھی اور اسی لمحے اس کے ہاتھ ایک تختہ آ گیا وہ کچھ دنوں تک اس تخت پر تیرتا رہا پھر اسے نہیں معلوم کیا ہوا (یعنی بے ہوش ہو گیا) اور اب جب اسے ہوش آیا تو ہمارے سامنے تھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی حتمی موت نہیں آئی تھی اس لئے وہ ایک ہفتہ قبل گرنے کے باوجود بچ گیا لیکن وہ مسافر جو کہ تھوڑی دیر قبل سمندر میں گرا تھا یوں کہ اس کی حتمی موت آ چکی تھی اس لئے وہ نہ بچ سکا یاد رکھیں کہ یہ حتمی موت اور

غیر حتمی موت سب میں خدا کی مصلحت ہے۔

موت کا وقت کیوں معلوم نہیں؟

﴿نَحنُ قَدَّرنَا بَينَكُمُ المَوتَ﴾

ہم نے موت کو معین کر دیا اور تمھارے لئے اس میں کچھ اختیار نہیں ہے اور تم میں سے کوئی بھی اپنی موت کے بارے میں آگاہ نہیں ہے کہ کب آئے گی ہر وقت موت کا خوف رہتا ہے بچپنے سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک ہر لمحے موت کا ڈر لگا رہتا ہے انسان چاہے تندرستی کی حالت میں ہو یا بیماری کی حالت میں موت ہر وقت آسکتی ہے۔

موت کا وقت نہ معلوم ہونے کی بہت سی حکمتیں ہوسکتی ہیں ان میں سے شاید ایک یہ ہو کہ موت کی وجہ سے انسان ہر وقت خدا سے ڈرتا رہے کہ کہیں وہ رہ راست سے ہٹ نہ جائے اور اس سے کہیں گناہ سرزد نہ ہو جائے اور خدانخواستہ کہیں کوئی واجب نہ رہ جائے موت ہی سبب بنتی ہے کہ انسان اپنی جوانی اور صحت پر اعتماد نہ کرے کیوں کہ بہت سے جوان تر اور سالم تر ایسے ہیں جو مر گئے۔

البتہ اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہیں مثلاً اگر انسان کو اپنی موت کا علم ہو جائے تو اسے اپنی زندگی میں مزہ نہ آئے۔

موت کے وقت خدا کی قدرت کا ظاہر ہونا

اگر چہ خدا کی قدرت کائنات کے ہر ذرّے سے آشکار ہے لیکن ایک وقت ایسا ہے جہاں خدا کی قدرت کا ظہور بہت زیادہ آشکار ہے اور وہ ہے موت کا وقت جیسا کہ ہم اسمائے الٰہی کو دعائے جوشن کبیر کے ضمن میں پڑھتے ہیں (یَامَن فِي المَمَاتِ قُدرَتُہ) اے وہ خدا جس کی قدرت (ہمارے) مرتے ہی آشکار ہو جائے گی اور معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی قدرت سب چیز پر غالب ہے، مرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم کتنی سنگین چیزوں کو اٹھالیا کرتے تھے اور ہماری زبان کتنی آسانی کے ساتھ حرکت کیا کرتی تھی ہمارے ہاتھ، پاؤں کس آسانی کے ساتھ حرکت کرتے تھے اور ہماری آنکھیں جس طرف چاہتیں گھومتی تھیں (ہم جہاں چاہتے تھے دیکھتے تھے) لیکن جب موت کا وقت آیا تو ہمارے اعضاء و جوارح جواب دے گئے تب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے اعضاء کی قوت ہماری نہیں تھی بلکہ اللہ وتبارک وتعالٰی کی عطا کردہ تھی (لا حول و لا قوۃ الا باللہ) کوئی قوت اور قدرت نہیں سوائے اللہ کے۔

اے قیامت کا انکار کرنے والو کیا تمہاری قدرت موت کے وقت کام آسکتی ہے؟

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ جب بھی تم چاہو کہ تمہارا دل عبادت کے لئے نرم ہو تو تم موت کو یاد کرو(۱) اسی وجہ سے اہلِ ایمان کی عادت میں سے ہے کہ وہ ہفتے میں دو دن جمعرات اور جمعہ کو قبرستان جاتے ہیں (۲) تا کہ موت ان کو یاد رہے اور وہ موت کو نہ بھولیں۔

---

(۱) منازل الآخرہ (۲) لئالی الاخبار ص ۲۷

درس (۳۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾

"ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کر دیا اور ہم ایسا کرنے سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہیں (نابود کر کے) دوسروں کو لے آئیں اور تمہیں ایسے عالم کی طرف لے جائیں کہ جس کو تم نہیں جانتے"

موت نابودی کا نام نہیں ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موت نابود ہو جانے کا نام ہے جب وہ لوگ اس غلط مفروضے کو تسلیم کر لیتے ہیں تو خود بخود ایسی مشکلات کی طرف روبرو ہو جاتے ہیں جو مذکورہ بالا مفروضے کی پیداوار ہے مثال کے طور پر جب یہ فرض کر لیا جائے موت

یعنی نابودی، موت یعنی عدم تو پھر پروردگار یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔

﴿نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ﴾ کہ ہم نے موت کو تقسیم کر دیا ہے کیا کوئی نابود چیز تقسیم ہو سکتی ہے؟

دوسری مشکل جو ان کے مفروضے کے تحت پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب موت نابودی ہے تو یہ خدا کی مخلوق کس طرح سے واقع ہو سکتی ہے جب کہ خدا خود فرماتا ہے کہ (الذی خلق الموت والحیاۃ)

"پروردگار وہ ہے جس نے موت اور حیات کو خلق کیا۔"

محققین ان اشکالات کا جواب دیتے ہیں کہ موت مطلق نابودی کا نام نہیں ہے بلکہ عدمِ ملکہ کا نام ہے یعنی حیات کے نہ ہونے کا نام موت ہے۔ مندرجہ بالا بیان شاید عام لوگوں کے لئے (جو کہ علمِ منطق، فلسفہ سے آشنا نہیں ہیں) قابلِ فہم نہ ہو لیکن مطلب کو بیان کرنے کے لئے ہم مجبور ہیں کہ اس کو بیان کریں۔

ملکہ اور عدمِ ملکہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابلے میں آتے ہیں مثال کے طور پر ایک انسان جس کے پاس آنکھیں نہ ہوں اسے ہم اندھا کہتے ہیں پس مذکورہ بالا مثال میں آنکھ کا ہونا ملکہ اور اس کا نہ ہونا (یعنی اندھا ہونا) عدمِ ملکہ کہلائے گا اس بات کے برعکس ہم ایک دیوار کو اندھا نہیں کہہ سکتے کیوں کہ آنکھ کا ہونا ایک ملکہ ہے اور اس ملکہ کی صلاحیت دیوار میں نہیں ہے جس کے فقدان کی وجہ سے ہم دیوار کو اندھا کہہ سکیں کیوں کہ عدمِ ملکہ وہاں پر صادق آتا ہے جہاں پر ملکہ کی صلاحیت ہو اگر آپ اس

مثال کو سمجھ گئے تو اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ ہم حیات،عدم (موت) اور عدم ملکہ کا وہاں پر اطلاق کر سکتے ہیں جہاں پر ملکہ (حیات) کی صلاحیت ہو جبکہ نابودی اور عدم محض میں حیات کی صلاحیت نہیں ہے جس میں حیات،عدم کے لفظ کا اطلاق کیا جا سکے اس بیان کے ذریعہ سے ہم ان اشکالات کا جواب دے سکتے ہیں۔

موت اور حیات دو امر وجودی اور آپس میں ضدین ہیں۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ موت اور حیات آپس میں ضدین (یعنی ایسی دو وجودی اشیاء جو کہ کبھی آپس میں نہ ملتی ہوں) ہیں جیسے کہ شب و روز جو آپس میں ضدین کہلاتے ہیں اور آپس میں کبھی نہیں ملتے مثلاً اگر رات ہوگی تو دن نہیں ہوگا اگر دن ہوگا تو رات نہ ہوگی اسی طرح موت اور حیات آپس میں کبھی نہیں ملتے جب موت ہوگی تو حیات نہ ہوگی اور جب حیات ہوگی تو موت نہ ہوگی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں زندہ بھی ہو اور مردہ بھی۔ اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ موت اور حیات نابودی کا نام نہیں بلکہ یہ دونوں وجودی چیز ہیں اور دونوں پروردگار کی مخلوق ہیں اس بات کی طرف روایت بھی اشارہ کرتی ہے جیسے کہ امام صادقؑ سے روایت ہے

ہے کہ زندگی اور موت دونوں خدا کی مخلوق ہیں (۱) اس بیان کے مطابق موت ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جانے کا نام ہے اور روح کی حیثیت ایک چراغ کی سی ہے جس کی روشنی انسانی آنکھ، کان، منہ اور دوسرے اعضاء کو منور کرتی ہے اور انسان اسی روح کی بدولت سنتا اور دیکھتا ہے جب روح اس بدن سے رخصت ہو جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے اور تمام اعضاء و جوارح ناکارہ ہو جاتے ہیں اور اسی کا نام موت ہے۔

موت یعنی گہری اور لمبی نیند

جب روح بدن سے نکل جاتی ہے تو روح کا رابطہ بدن سے ٹوٹ جاتا ہے اور بدن جمادات کی مانند بے جان اور عقل و شعور سے خالی ہو جاتا ہے۔

باالفاظ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ موت ایک گہری اور طویل نیند کی مانند ہے عام نیند اور موت میں بس اتنا فرق ہے کہ عام نیند میں بعض حواس مثلاً نظام تنفس اور نظام ہاضمہ وغیرہ کام کرتے رہتے ہیں جب کہ موت میں یہ سب ناکارہ ہو جاتے ہیں اور موت کی وجہ سے روح اور بدن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ زندگی روزِ روشن کی مانند جبکہ موت تاریکی شب کی طرح ہے جب ہم نابودی خیال کرتے ہیں جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے بعد انسان کامل تر ہو جاتا ہے اور اس کے احساسات کامل تر ہو جاتے ہیں اور وہ بدن کے پنجرے سے آزاد ہو جاتا ہے۔

---

(۱) شرح نہج البلاغہ (ابن میثم)

پہلے وہ صرف آنکھوں کے دو سوراخوں سے دیکھتا تھا جس میں محدودیت تھی اور وہ شاید ایک میل سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا تھا وہ دیوار کے پیچھے سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

لیکن مرنے کے بعد اس پر سے حجاب اُٹھ جاتا ہے اس کے لئے تمام اشیاء واضح اور روشن ہو جاتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں موت انسان کو کامل کرتی ہے اور روح کو آزادی دلاتی ہے مومن انسان کی روح اس طرح سے باہر نکلتی ہے جیسے صدف سے موتی نکل جائے یا ایسے کہ جیسے کوئی پرندہ کسی پنجرے سے آزاد ہو جائے۔

اسی وجہ سے امام علیؑ موت کے مشتاق ہیں بلکہ وہ قسم کھا کر فرماتے (۱) ہیں کہ خدا کی قسم علی ابن ابی طالبؑ موت سے اس سے بھی زیادہ مانوس ہے جتنا کہ ایک بچہ اپنے ماں کے سینے سے مانوس ہوتا ہے۔ کیا امام علیؑ یک نابود چیز سے مانوس ہیں؟ نہیں بلکہ وہ جانتے ہیں کہ موت کے بعد ملکوتِ اعلیٰ کی طرف سفر کرنے والے ہیں جہاں دنیا کی تمام پریشانیوں سے نجات مل جاتی ہے واقعی اس عظیم نعمت پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے (الحمد لله الذی خلق الموت و الحیاة) اس کے بعد ذیل میں ہم باقی ماندہ آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ﴾

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ (۵)

کسی قسم کی ناتوانی خدا میں نہیں

مسبوق پیچھے رہ جانے، ضعیف اور ناتوانی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جب دو آدمی ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں اب جو ضعیف ہوتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے اور طاقت ور آگے نکل جاتا ہے عربی زبان میں آگے نکل جانے والے کو سابق جب کہ پیچھے رہ جانے والے کو مسبوق کہتے ہیں۔

اب اگر آیت میں ملاحظہ کریں تو پروردگار اپنے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ﴾ اور ہم پیچھے رہ جانے والوں (کمزوروں) میں سے نہیں ہیں کہ کچھ نہ کر سکیں بلکہ ﴿عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ﴾ ہم تمھارے بجائے کسی اور کو لا سکتے ہیں یعنی ہم تمھارے بجائے دوسرے گروہوں کو تمہاری جگہوں پر لا سکتے ہیں تم لوگ اپنے والدین کی جگہوں پر جبکہ تمہارے بچے تمہاری جگہوں پر آجائیں گے اور پروردگار ایسا کرنے سے عاجز نہیں ہے اور جب ہم نے کسی کی موت کو مقرر کر دیا تو تم سب مل کر بھی اسے ٹالنا چاہو تو نہیں ٹال سکتے اور اس میں کچھ دیر کی تاخیر بھی نہیں کر سکتے۔

شیخ الرئیس بو علی سینا جو کہ علم طب کے بہت بڑے ماہر تھے جن کی کتاب القانون (جو کہ طب کے موضوع پر لکھی گئی ہے) بہت مشہور ہے ۴۹ برس کی عمر میں انتقال کر گئے جب کہ بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جنہیں علم طب سے چنداں آشنائی نہ تھی لیکن وہ لوگ بو علی سینا کی نسبت دوگنی زندگی گزار کر اس دنیا سے گئے۔

خلاصے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی سنت رہی ہے کہ ایک گروہ اس دنیا سے جائے اور دوسرا گروہ ان کی جگہ لے لے اور اس سنت الٰہی کے آگے ہر چیز مغلوب ہے اور اللہ کی سنت ہر چیز پر غالب ہے۔

ایسے عالم کی طرف آؤ گے جس سے بے خبر تھے

﴿وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾

تمہیں نہیں معلوم اور تم نے کبھی اس کا خیال بھی نہ کیا ہوگا کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور مرنے کے بعد کہاں جاؤ گے اور کیسی کیسی منزلیں درپیش آئیں گی اور کس کس مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت میں پچاس مقامات ایسے آئیں گے جہاں پر رکنا ہوگا اور ان پچاس (۵۰) مقامات میں سے ہر ایک مقام پر ہزار سال رکنا ہوگا (البتہ یہ توقف ہر شخص کا اپنی مشکلات کے اعتبار سے ہوگا) (۱)

آخرت میں کیا حال ہوگا؟ کیا آپ نے سنا ہے کہ رحلت کے وقت امام حسن مجتبیٰ گریہ کر رہے تھے اس رونے کی وجہ دریافت کی گئی تو امامؑ نے فرمایا کہ دستوں کی جدائی اور ھول مطلع (۲) یہ ھول مطلع کیا ہے؟

ابن اثیر نے اپنی کتاب نہایۃ اللغہ میں اسی طرح علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں بیان کیا ہے کہ (ھو الاشراف من وضع عال الیٰ الحدار) کہ

---

(۱) بحار الانوار جلد (۳) (۲) بحار الانوار جلد (۱۰)

اب کوئی شخص اونچی جگہ سے کسی خوفناک منظر کو دیکھے اب اس منظر کو دیکھنے کے بعد جو حالت پیدا ہوتی ہے اسے عربی میں ھول مطلع کہتے ہیں۔

پس امام حسنؑ فرما رہے ہیں کہ موت کے وقت ھول مطلع اور دوستوں سے جدائی ہوگی اس وقت انسان کا کیا حال ہوگا جب اس کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں گے اور وہ جنتی لوگوں کو دیکھے گا پروردگار کی رحمتوں اور احسانوں کو دیکھے گا اسی کے ساتھ ساتھ جہنمیوں کو بھی دیکھے گا اس لمحے اس کے اضطراب کا کیا عالم ہوگا واقعی وہ لمحہ بڑا ہی عجیب ہوگا۔

درس (۳۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی فَلَوْ لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾

دنیاوی کمال کی طرح موت بھی کمال کا ذریعہ ہے

مندرجہ بالا آیت میں قیامت کے جھٹلانے والوں سے خطاب کیا جارہا ہے کہ تمہیں کیوں بعید لگ رہا ہے کہ عالم دنیا کے بعد بھی ایک اور عالم ہے اگرچہ گزشتہ آیات میں منکروں کو جواب دینے کے لئے بحث کی گئی ہے لیکن یہاں پر اور بھی تفصیل دی جارہی ہے ﴿ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی فَلَوْ لَا تَذَكَّرُوْنَ ﴾ کہ تم لوگ دنیا کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہو تو پھر اسے یاد کیوں نہیں کرتے جب دنیا میں پروردگار نے تمہیں ایک قطرے سے پیدا کیا ہے تو کیا وہ دوبارہ خلق نہیں کرسکتا۔

جب کہ بعض مفسرین نے کہا ہے (اَلنَّشْاَةَ الْاُوْلٰی) دنیا کی زندگی کا ہر لحہ

عبرت ہے اور ہر لحہ ایسا ہے جس سے سبق سیکھا جائے۔

دنیا کی عبرتوں میں سے ایک سبق یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز کمال کی طرف گامزن ہے جمادات نباتات کا جز بنتے ہیں اور حیوانات انسانوں کی غذا بن کر کمال حاصل کرتے ہیں اب سوچنا یہ ہے کہ کیا مرنے کے بعد انسان بھی کمال کی طرف جائے گا؟ ہاں جائے گا اگر نیک عمل کرتا رہے اگر خدانخواستہ صراط مستقیم کے بجائے گمراہی کی طرف حرکت کی تو پستی کی طرف جائے گا (انسان کو کہیں نہ کہیں جانا ہے چاہے کمال کی طرف یا پستی کی طرف وہ ساکن رہنے والا نہیں) اسی طرح جنت کی نعمتوں میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا (ولدینا مزید) پس انسان کو چاہئے کہ وہ دنیا سے سبق سیکھے اور کمال کی طرف حرکت کرتا رہے تاکہ اس کے لئے موت بھی کمال کا ذریعہ بن جائے۔

رحم مادر دنیا کی مانند جب کہ دنیا برزخ کی طرح ہے

اگر تم دنیا کی زندگی پر غور کرو تو تمہیں معلوم جائے گا کہ جب تم رحم مادر میں تھے اور کوئی تم سے یہ کہتا کہ شکم سے باہر بھی ایک دنیا موجود ہے اس فضا سے ہٹ کر بھی ایک عالم ہے جس کا اس شکم مادر کی زندگی سے کوئی قیاس ہی نہیں ہے جہاں پر مختلف قسم کے میوے ہوں گے اور وہاں پر تناول کرنے کا انداز اس ناف سے حاصل کی گئی غذا سے بہت مختلف ہوگا تو کیا تم یقین کر لیتے اگرچہ بعد میں تم نے دنیا میں آنے کے بعد سب کچھ دیکھا جو سنا تھا پس جان لو کہ پیٹ کی مثال دنیا کی طرح ہے جب کہ

دنیا کی مثال عالم برزخ کی طرح ہے۔

(جہاں تم نے دنیا کے بارے میں یقین نہ کیا) بالکل اسی طرح جب تم سے دنیا میں کہا جارہا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ بھی ایک عالم ہے جس کے بارے میں نہ تمھارے کانوں نے سنا اور نہ تمھاری آنکھوں نے دیکھا اور نہ تمھارے دلوں میں اس کے بارے میں کبھی خیال آیا لیکن مرنے کے بعد بالکل دنیا کی طرح تم اس عالم کو بھی دیکھ لوگے اور یہی عالم برزخ ہوگا۔

نیند کے بعد بیداری ایک قسم کی قیامت ہے

دنیا کی عبرتوں میں سے ایک عبرت تمھارا سونا اور جاگنا ہے لوگ قیامت کے کیوں کر منکر ہیں؟ جب کہ دن میں ایک یا دو مرتبہ زندہ ہوتے اور مرتے ہیں کیوں کہ سونا اور جاگنا زندہ ہونے اور مرنے کی طرح ہے۔

جس طرح مرنے کے بعد اعضاؤ جوارح وکام نہیں کرتے اسی طرح سوتے وقت بھی بہت سے اعضاؤ جوارح کام نہیں کرتے ہر شخص کو نیند آتی ہے لیکن اس کو پروردگار بیدار کرتا ہے جس کی زندگی باقی ہو اگر سونے والے کی زندگی کے دن پورے ہوگئے ہوں تو وہ بیدار نہیں ہوتا (۱) اسی وجہ سے رسول گرامی حضرت محمد مصطفیٰ ؐ جب سونے کے بعد سحر میں بیدار ہوتے خدا کا شکر ادا کرتے کہ خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندگی عطا کی (۲)

---

(۱) سورۃ (۳۹) آیۃ (۴۲) (۲) حاشیہ مفاتیح الجنان

لقمان حکیم سے بھی ایک حکایت نقل ہوئی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ مجھے حیرت ہے ان لوگوں پر جو ہر روز سو کر اٹھتے ہیں اس کے باوجود قیامت کے منکر ہیں۔

تفسیر برحان وغیرہ میں ایک روایت حضرت سید سجادؑ سے نقل ہوئی ہے جس میں امامؑ فرماتے ہیں کہ عجیب حیرت ہے اس شخص پر جو دنیا کو مشاہدہ کرتا ہے اس کے باوجود قیامت کا منکر ہے اور اس سے بھی بڑی حیرت مجھے اس شخص پر ہے جو قیامت کو مانتا ہے اس کے باوجود صرف دنیا میں مشغول ہے۔

واقعی حیرت ہے قیامت کے منکروں پر حالانکہ دنیا کی درو دیوار سے موت اور حیات نظر آتی ہے کیا آپ جانتے ہیں کہ خزاں میں پتے کس حال میں ہیں آپ اسے نیند کی حالت کہہ لیں یا اس کا نام موت رکھ لیں، موسم بہار کے آتے ہی یہ دوبارہ زندہ ہوجاتے ہیں پھر خزاں میں مرجھا جاتے ہیں یہ سب دیکھنے کے بعد بھی کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں آتا؟

اور آخر میں ہم امام سجادؑ کے فرمان کے دوسرے جملے کو یہاں پر موعظہ کے طور پر نقل کررہے ہیں۔

اگر آخرت حق ہے تو پھر کیوں۔۔۔؟

اس شخص پر بہت زیادہ حیرت ہوتی ہے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے

---

(۱) حاشیہ مفاتیح الجنان

اشھدان الموت حق و البعث حق کہتا ہے اس کے باوجود اس دودن کی دنیا کے ساتھ دل لگا کر بیٹھ گیا ہے اور اس کا سارا غم اسی دنیا کے لئے ہو کر رہ گیا ہے۔ رسول اکرمؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا ان لوگوں کے لئے ہے جن کا کوئی گھر نہ ہو اور یہ ان لوگوں کے لئے دولت ہے جن کے پاس عقل نہ ہو(۱) اور دنیا ان کے نزدیک سب کچھ ہے جب کہ مومن کی ذات اس بات سے بالاتر ہے کہ وہ دودن کی دنیا کی خاطر اپنے آپ کو وقف کردے۔

شیخ بہائیؒ نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت امام حسنؑ کی خدمت آیا اور عرض کی مولی مجھے موت سے خوف آتا ہے (ایسا کیوں ہے؟) امام حسنؑ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے دنیا آباد کرلی ہے۔ یعنی کوئی شخص بھی جس نے دنیا کو آباد کررکھا ہوگا وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ آبادی سے بربادی کی طرف جائے لیکن جس شخص نے آخرت آباد کی ہوگی وہ موت کی آرزو کرے گا، اس بیان کے ساتھ ساتھ آخر میں ہم آپ کے سامنے ایک بشارت بھی عرض کرتے ہیں (تاکہ آپ مومنین کا دل مطمئن رہے)

اہل بیتؑ کی زیارت کے شوق میں اپنی جان دے دیں گے

معالم الزلفی نامی کتاب میں مذکور ہے کہ ایک شخص حضرت امام صادقؑ کی

---

(۱) سفینۃ البحار ج(۱) ص(۴۷۵)

خدمت میں آکر کہتا ہے کہ ہم لوگ موت سے بہت ڈرتے ہیں کہ کس طرح ہماری موت واقع ہوگی؟۔

امامؑ نے اسے خوش خبری دی کہ ملک الموت جب ہمارے شیعوں کی روح قبض کرنے آتا ہے تو ان سے کہتا ہے کہ اپنے سامنے دیکھو اور جب یہ اپنے سامنے انوار طیبہ حضرت محمدؐ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کو پاتا ہے تو یہ دیکھ کر وہ ان ہستیوں کی زیارت کے شوق میں فرشتوں سے کہتا ہے کہ میری جان لے لو تاکہ جلدی سے میں ان کے جوار میں حاضر ہوسکوں جی ہاں جس نے ہمیشہ یاحسین کہا ہو اور کبھی بھی اس نے امام بارگاہوں کو نہ چھوڑا ہو تو اس کو بھی مشکلات میں یہ ہستیاں تنہا نہیں چھوڑیں گی۔

درس (۳۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾

"کیاتم نے دیکھا ہے (اس بیج) کو جسے تم لوگ بوتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم اسے اگاتے ہیں اگر ہم چاہیں تو اسے برباد کردیں پس تم لوگ ایک دوسرے کے اردگرد بیٹھ کر گریہ وزاری کرو گے کہ بے شک ہم ہی گھاٹے میں رہے بلکہ ہمیں کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا اور ہم بے بہرہ ہی رہے۔"

بیج کو خدا اگاتا ہے

قدرت الٰہی میں سے ایک زراعت ہے جس کو خداوندِ متعال ذکر فرمارہا ہے

کہ ﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ﴾ کیاتم نے دیکھا ہے اس بیج کو جسے تم بوتے ہو حرث کے معنی بیج بونے کے ہیں اور حارث کے معنی بیج بونے والے کے ہیں جب کہ زرع کے معنی اگانے کے ہیں اس لحاظ اس آیت کا ترجمہ یہ ہو کہ اے کسانو یہ بیج جو تم بوتے ہو کیاتم نے اس کو دیکھا ہے۔

﴿ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ﴾

کیاتم اسے اگاتے ہو یا ہم اسے اگانے والے ہیں اور ان کو تم سرسبز کرتے ہو یا ہم، ایک دانہ دس گنا، سو گنا یا ہزار گنا بڑھ جاتا ہے ایک خربوزے یا تربوزے کا دانہ ہزاروں دانوں کو جنم دیتا ہے کیا یہ خود سے ہو جاتا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ خود سے نہیں ہو سکتا۔

شاید بعض لوگ یہ کہیں کہ زمین میں ایسا کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن یہ بات بھی جھوٹ ہے کیوں کہ زمین میں یہ خاصیت ہے کہ ہر چیز کو اپنے جیسا بنادیتی ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ میت چند سالوں میں خاک میں تبدیل ہو جاتی ہے اس لحاظ سے بیج کو بھی خاک میں بدل جانا چاہئے۔

بیج کا زمین میں حرکت کرنا

اگر کھجور کے بیج کو زمین میں بو دیا جائے تو یہ دو حصوں میں تبدیل ہو جاتا ہے ایک حصہ بالائی جانب جب کہ دوسرا حصہ زیر زمین رشد کرنے لگتا ہے، اگر ہم زمین کی خاصیت میں غور کریں تو ہمیں خاک کی طبیعت میں سکون نظر آئے گا تو اگر

کھجور کے بیج کو زمین میں بو دیا جائے تو یہ دو حصوں میں تبدیل ہو جاتا ہے ایک حصہ بالائی جانب جب کہ دوسرا حصہ زیر زمین رشد کرنے لگتا ہے، اگر ہم زمین کی خاصیت میں غور کریں تو ہمیں خاک کی طبیعت میں سکون نظر آئے گا تو پھر کونسی ایسی قوت ہے جو اس دانے کے ہمراہ ہے، جس کی وجہ سے یہ بیج حرکت اور رشد کرنے لگتا ہے اور بیج کی حرکت اتنی قوی ہے کہ یہ پتھروں کو بھی اپنے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ہر متحرک کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے، اسمائے الٰہی میں سے ایک اسم (فالق) ہے جس کے معنی شگافتہ کرنے والے کے ہیں، یا فالق الحب والنوی یعنی اے خدا جو دانے کو شگافتہ کرنے والا ہے، اور اسی دانے کا ایک حصہ بڑھ کر جڑ کو جب کہ دوسرا بڑھ کر تنے کو تشکیل دیتا ہے۔

آپ کے سامنے میں نے کھجور کے بیج کی مثال دی کیوں کے یہ ایسا بیج ہوتا ہے جو کہ لوہے اور پتھر سے بھی مشکل سے ٹوٹتا ہے لیکن اس ننھے سے بیج میں کتنی توانائی ہے کہ اسے آسانی کے ساتھ دو کر دیتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ اس بیج کے دونوں حصے دو مختلف سمتوں میں حرکت کرتے ہیں اور یہ دونوں حرکتیں آپس میں متضاد ہیں جب کہ طبیعت میں ایک ہی حرکت ہے وہ بھی نیچے کی جانب نہ کہ اوپر کی جانب۔

پس یہ ساری قوت جو اس بیج کے پاس ہے یہ خدا کی عطا کردہ ہے اور جب بھی اس بیج کو خاص شرائط میسر آجائیں یہ تولید مثل کرتا ہے اور ایک دانہ کئی دانوں میں

تبدیل ہو جاتا ہے پس حقیقت میں پیدا کرنے والا خدا ہے نہ وہ شخص جو کہ بیج ڈالتا ہے۔ اسی وجہ سے روایت میں آیا ہے جس میں حضرت خاتم الانبیاءؐ فرماتے ہیں تم میں سے کوئی اپنے آپ کو زارع (پیدا اور نشونما) کرنے والا نہ کہے بلکہ اپنے آپ کو حارث (بیج ڈالنے والا) کہے(۱)

جو کہ بیج ڈالتا ہے۔ اسی وجہ سے روایت میں آیا ہے جس میں حضرت خاتم الانبیاءؐ فرماتے ہیں تم میں سے کوئی اپنے آپ کو زارع (پیدا اور نشونما) کرنے والا نہ کہے بلکہ اپنے آپ کو حارث (بیج ڈالنے والا) کہے(۱)

اگر چہ بعض لوگوں نے زارع کا معنی بھی کسان کا کیا ہے شاید اس بنیاد پر کہ یہ انسان بیج ڈالتا ہے اور زمین ہموار کرتا ہے اس لحاظ سے اسے بھی زارع کہہ دیا، حالانکہ ایسا کہنا صحیح نہیں ہے یا کم سے کم مکروہ ضرور ہے۔

زمین کو خالی نہ چھوڑیں

ایک روایت کے مطابق رسول خداؐ کسی روز مدینہ سے باہر کسی مقام سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ بعض زمینیں انصار کی ایسی ہیں جن پر کاشتکاری نہیں ہوئی ہے تو رسول خداؐ نے پوچھا کہ اس زمین کو خالی کیوں چھوڑ رکھا ہے؟ تو آپ کو جواب دیا گیا کہ پانی نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح کیا گیا ہے کیوں کہ عام پانی نہیں ہے اور بارش کا بھی بھروسہ نہیں ہے ہوسکتا ہے کہ بارش ہو ہوسکتا ہے کہ بارش نہ ہو اس وجہ سے

---

(۱) مجمع البیان (۲) نورالثقلین

زمین کوایسے ہی خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ رسول خداؐ اس بات سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ واقعی زراعت خداوند کے ہاتھوں میں ہے (۲) چاہے تو پانی سے زراعت کرے یا بادلوں یعنی بارش کے پانی سے زراعت کرے اور یہ خدا ہی کی ذات ہے جو بارش کا بھی رب ہے اور ان جیسی بہت سی روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ زمین کو خالی نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ بیج وغیرہ ڈال دینا چاہئے اور جو زارع حقیقی ہے اس سے امید رکھنی چاہئے اسی طرح معنویات میں بھی اپنے عمل پر توجہ کئے بغیر کہ آیا اس بارگاہ کے لائق ہے کہ نہیں صرف ہمیں خدا سے امید رکھنی چاہئے اور آدھی رات کو اٹھ کر عبادت کا بیج بونا چاہئے کہ شاید اس ایک عمل اللہ اکبر یا یارب کہنے کی وجہ سے ہماری اصلاح ہوجائے (اور خدا کے فضل وکرم کی بارش ہوجائے)

(یـا مَـنْ یَقْبَلُ الیَسِیْرَ وَیَعْفُو عَنِ الکَثِیْرِ) خدایا اپنے فضل سے ہمارے ساتھ معاملہ کر (نہ کہ ہمارے اعمال کے حساب سے)

اگر ہم چاہیں تو زراعت کو برباد کردیں

﴿لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا﴾ اگر ہم چاہیں تو اس زراعت (فصل) کو (تمھارے گناہوں کی وجہ سے) برباد کردیں۔

آیت میں حُطامًا کا لفظ ہے جس کے معنی درہم برہم اور خراب کردینے کے معنوں میں یا اسی طرح اس چیز کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس کا کوئی ثمرہ نہ ہو جیسے کہ سیم خوردہ زمین جس سے بالکل فائدہ نہ اٹھا سکتے ہوں۔

﴿فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ﴾ پس تم لوگ ایک دوسرے کے اردگرد بیٹھ کر گریہ وزاری کروگے۔

﴿اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ﴾ بے شک ہم ہی گھاٹے میں رہے (ہم نے کتنے دنوں تک زحمت کی، زمین ہموار کی، بیج ڈالا لیکن سب کچھ برباد ہوگیا)

﴿بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ﴾ بلکہ ہمیں کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا اور ہم بے بہرہ ہی رہے۔

سچ ہے کہ انسانی گناہ اس کی فصل پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور اس بابت راویات کے علاوہ بہت سے لوگوں کو تجربہ بھی ہے کہ گناہوں کا اثر زراعت پر بھی پڑتا ہے۔

بالکل اسی طرح دل ومعنویت کی بھی زراعت ہے، اگر کسی نے اپنے دل میں عمل کے بیج کو بویا ہے اور اس کا دل گناہوں کے خار وخاشاک سے دور ہے تو آفتابِ عنایتِ پروردگار سے پھلے اور پھولے گا، نہیں تو گناہوں کی تیرگی اس عمل کے بیج کو کھا جائے گی۔

زراعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ

تفسیر برہان میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ اگر کسان چاہتا ہے کہ اس کی فصل آسمانی اور زمینی بلاؤں سے محفوظ رہے تو اسے چاہئے کہ جب وہ کاشتکاری کے لئے بیجوں کو ڈالنا چاہے تو قبلہ کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو اور بیجوں کو

اپنے ہاتھوں میں لے کر تین مرتبہ مندرجہ ذیل آیتوں کی تلاوت کرے ﴿أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ﴾

اس کے بعد تین مرتبہ محمد و آل محمد پر درود بھیجے اور تین مرتبہ کہے (اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الزَّارِعُ) کہ اے اللہ تو زراعت کرنے والا ہے۔

بالکل اسی طرح زراعتِ معنوی میں بھی ہے اسی لئے نماز میں سب سے پہلے جو چیز پڑھتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ ربنا علیک توکلنا انبنا و الیک المصیر (پروردگار ہم صرف عمل انجام دیتے ہیں اس کا قبول کرنا تیرے اختیار میں ہے اور ہماری امیدیں صرف تجھ سے وابستہ ہیں۔

بارش کا پانی برکت والا ہے

﴿أَفَرَءَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ﴾

کیا تم نے اس پانی کو دیکھا (اور توجہ کی) ہے جو کہ بادلوں سے قطرہ قطرہ ہو کر گرتا ہے کیا تم ان بارش کے قطرات کو نیچے کی طرف بھیجتے ہو یا ہم نیچے کی سمت بھیجنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا (کھارا) کر دیں تو پھر (اللہ کی اس نعمت کا) شکر ادا کیوں نہیں کرتے۔

خدا کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں ان نشانیوں میں سے ایک نشانی

بارش کا پانی ہے بارش کا پانی میٹھا ہوتا ہے جو پینے کے کام آتا ہے اگرچہ پینے کے لئے چشمے وغیرہ کا بھی پانی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا استعمال بارش کے پانی کی نسبت کم ہے خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں چشمے وغیرہ کا پانی بہت کم ہے بلکہ نایاب ہے جیسے کے عربستان کا علاقہ کہ جہاں پانی کا واحد ذریعہ بارش کا پانی ہے۔

آیت میں مزن کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ابر (بادل) کے ہیں جب کہ بعض نے اس کا معنی سفید بادل کیا ہے کیوں کہ وہ پانی جو کہ سفید بادل سے نیچے گرتا ہے زیادہ میٹھا ہوتا ہے اس اعتبار سے آیت کا معنی کچھ اس طرح سے ہوگا کہ، کیا تم نے اس پانی کو دیکھا (اور توجہ کی) ہے جو کہ بادلوں سے قطرہ قطرہ ہو کر گرتا ہے کیا تم ان بارش کے قطرات کو نیچے کی طرف بھیجتے ہو یا ہم نیچے کی سمت بھیجنے والے ہیں؟

توحید میں حضرت امام جعفر صادقؑ مفضل سے فرماتے ہیں کہ ذرا دیکھو تو خدا نے بادلوں کو کس طرح سے خلق فرمایا ہے کہ بادل قطرہ قطرہ پانی کو زمین کی سمت بھیجتا ہے ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی زحمت کے ایک دفع میں پانی کو نیچے کی سمت گرا دے کیوں کہ اگر مسلسل بارش ہو جائے تو سیلاب آجاتا ہے اور اگر خدانخواستہ یہ بادل سارے پانی کو ایک دفعہ میں ہی زمین پر گرا دے تو زمین کا کیا حال ہوگا؟۔

بادل خدا کے ارادے کے تابع ہیں

﴿أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ﴾ یا ہم بارش کو بھیجنے والے ہیں

اور یہ بادل ہمارے ارادے کے تابع ہیں کیا کسی کو اس میں شک ہے؟ کیا تم نے ان بہت سے بادلوں کو نہیں دیکھا جو تمھارے سروں سے برسے بغیر یوں ہی گزر جاتے ہیں اور ایک قطرہ بھی نہیں برستا اور نہیں معلوم کہ یہ کوہ پیکر بادل کہاں جا رہے ہیں اور کبھی اچانک ہی بادل آجاتے ہیں اور جھوم کر برسنے لگتے ہیں۔ ﴿لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ أُجَاجاً﴾ اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا (کھارا) کر دیں یعنی ہم چاہیں تو اسی میٹھے پانی کو کھارا اور ناگوار بنا دیں۔

﴿فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ﴾ تو پھر (اللہ کی اس نعمت کا) شکر ادا کیوں نہیں کرتے اور میٹھا پانی پینے کے باوجود گناہ کرتے ہو۔

دریائے نیل کا فرعونیوں کے لئے ناگوار ہو جانا

اگر ہم چاہیں تو اس میٹھے پانی کو تلخ کر دیں جیسے کہ نیل کا پانی فرعونیوں کے لئے ناگوار ہو گیا (تمھارے لئے بھی یہ پانی کھارا ہو سکتا ہے)۔

فرعون کے حواری جب بھی اس دریا سے پانی لیتے یہ پانی ان کے لئے خون بن جاتا آخر کار وہ پیاس سے تڑپنے لگے اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے کہ وہ لوگ آئیں اور اپنے ہاتھوں سے پانی لیکر ان کے منہ میں ڈالیں، بنی اسرائیل دریا سے پانی کو لیتے اور فرعونیوں کے منہ میں ڈالتے یہ پانی ان منہ میں جاتے ہی خون بن جاتا اس بات سے مجبور ہو کر وہ حضرت موسیٰ کے پاس آئے اور کہا کے یہ بلا ہم سے دور کر دیں اس واقعہ کے باوجود وہ لوگ ایمان نہ لائے۔

انسان پروردگار کے ارادے کے سامنے بہت ضعیف ہے لیکن اتنا بے حیا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مہلت سے غلط استفادہ کرتا ہے اور توبہ کرنے بجائے گناہ پہ گناہ کرتا جاتا ہے۔

فَلَكَ الْحَمْدُ عَلَىٰ حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ وَعَلَىٰ عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ پروردگار تیرا شکر ہے تیرے حلم و بردباری پر اس کے بعد کے تو ہر چیز سے باخبر ہے (اور) تیرے معاف کر دینے پر اس کے بعد کے تو (سزا) پر قدرت رکھتا ہے۔

واقعی خدا کی دی ہوئی فرصت پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے اور بھولنا نہیں چاہئے کہ وہ جب چاہے انتقام لے سکتا ہے۔

خَيْرُكَ إِلَيْنَا نَازِلٌ وَشَرُّنَا إِلَيْكَ صَاعِدٌ۔

درس (۳۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ﴾

"تو کیا تم نے آگ پر بھی غور کیا تو جیسے تم لوگ لکڑی سے حاصل کرتے ہو کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا یا ہم نے پیدا کیا ہم نے آگ کو (جہنم کی) یاددہانی اور مسافروں کے فائدے کے واسطے پیدا کیا"

کل رات کی گفتگو کو مکمل کرنے کے لئے ہم (بارش کے بارے میں) بحار الانوار سے ایک روایت نقل کر رہے ہیں۔

جب بھی بارش ہوتی مولیٰ امیر المومنینؑ اپنے آپ کو بارش کے نیچے کر لیتے اور عمامہ وغیرہ کو اتار دیتے تا کہ بارش کے قطرے سر مبارک اور صورت پر پڑ سکیں اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ کو سر اور صورت پر پھیرتے اور فرماتے بارش اللہ کی رحمت ہے

اور اس میں شفاء ہے۔

دوسری بات شکرِ منعم کے بارے میں تھی کہ پروردگار فرماتا ہے کہ ﴿فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ﴾ تو پھر (اللہ کی اس نعمت کا) شکر ادا کیوں نہیں کرتے، شاید بعض لوگ یہ کہیں کہ بارش کا پانی عربوں کے لئے نعمت ہے ہمارے پاس تو چشمے وغیرہ ہیں۔ یہ جاہل لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ خدا جہاں بھی چاہے دوزخ بنا دے۔

اگر خدا چاہے تو چشمے کے پانی کو بھی کھارا یا خشک کر دے جیسا کہ خدا نے مشرک کے ساتھ کیا۔

کسی جاہل نے جب سورہ مبارکہ الملک کی آیت (۳۰) قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ (اے رسول کہہ دیجئے کہ کیا دیکھا تم نے کہ اگر تمہارا پانی خشک ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے پاس جاری پانی کو لا سکے) کو سنا تو کہنے لگا کہ (یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے) ہم پانی کے لئے کنویں کھود لیں گے لیکن شاید یہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اگر خدا چاہے تو ان چشموں اور کنوؤں دونوں کو خشک کر دے۔ جب یہ صبح سو کر اٹھا تو اندھا ہو چکا تھا لوگوں نے کہا کہ دیکھا تو نے کہ تیری آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں لیکن اس کا پانی خشک ہو چکا ہے، بالکل اسی طرح اگر خدا چاہے تو کنوؤں اور چشموں دونوں کے پانی کو خشک کر سکتا ہے۔

مرطوب درخت کا آتش پیدا کرنا

ان جملہ شواہد میں سے (جو کہ خدا کی قدرت کے بارے میں ذکر ہوئے اور

جس سے انسان واضح طور سے سمجھ سکتا ہے کہ خدا کے لئے دوبارہ پیدا کردینا چنداں مشکل نہیں ہے) ایک شاہد اور دلیل ایک قسم کا مرطوب درخت ہے جس کا ذکر پروردگار نے مندرجہ ذیل آیت میں کیا ہے۔

﴿أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ﴾

"کیا تم نے دیکھا اس آگ کو جسے تم روشن کرتے ہو"

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ باتیں مقدمے کے طور پر پہلے ذکر کردی جائیں تاکہ مطلب کو آسانی سے سمجھا جاسکے۔

(گزشتہ زمانوں میں) عربستان کے علاقوں میں آگ دو درختوں کی لکڑیوں کو رگڑ کر حاصل کی جاتی تھی یہ دو درخت مرخ اور عفار کہلاتے ہیں جو کہ عربستان میں اکثر مقامات پر اور ہر موسم میں پائے جاتے تھے اور ان کی خاصیت یہ ہے کہ یہ نر اور مادہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ سرسبز رہتے ہیں، عرب ان کی لکڑیوں کو لیتے اور ان کو آپس میں رگڑتے تو اس کے نتیجے میں آگ حاصل ہوتی تھی جس طرح سے چقماق سے آگ حاصل ہوتی ہے۔

واقعی خدا کی قدرت ہے کہ ان سرسبز اور مرطوب درختوں سے آتش روشن کردے۔

اگرچہ تمام درختوں میں آگ پائی جاتی ہے یعنی ہر درخت کی لکڑی جلتی ہے لیکن یہ دونوں درخت بہت ہی عجیب ہیں کہ جن کے رگڑنے سے آگ حاصل ہوتی ہے۔

زیتون کا درخت سرسبز اور مرطوب ہوتا ہے اور زرا سے فشار دینے سے پانی نکل آتا ہے لیکن اس کا تیل آگ کا سبب بنتا ہے۔ واقعی خدا کی قدرت ہے کہ ایک ہی جسم میں آگ اور پانی جمع ہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے مغلوب نہیں ہوتے۔

سورہ یٰسین میں بھی پروردگار نے ایسے درخت کا ذکر فرمایا ہے جس سے آتش پیدا ہوتی ہے اور اس درخت کو اپنی نعمت اور قیامت کے لئے دلیل قرار دیا ہے (۱) جب کہ یہاں پر بھی آگ کے بارے میں فرما رہا ہے کہ کیا تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے تم روشن کرتے ہو؟

﴿ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ﴾

کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔

آگ پیدا کرنے والے درخت کا مقصد

دنیا میں اس آگ والے درخت کا مقصد تو معلوم ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اس درخت کے ذریعے سے آگ حاصل کرتا ہے تاکہ آگ سے اپنی ضروریات کو پورا کرسکے لیکن اس درخت کا اہم مقصد وہ ہے کہ جسے پروردگار مندرجہ ذیل آیت ﴿نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً﴾ (کہ ہم نے اس درخت کو (لوگوں کے) تذکر قرار دیا ہے) میں بیان فرما رہا ہے۔

اے لوگو جان لو اگر ہم پانی سے آگ پیدا کرسکتے ہیں تو یہ تمہارے لئے

---

(۱) سورۂ یٰسین ۳۶ آیت ۸۰

تذکر ہے کہ ہم تمہیں دوبارہ بھی زندہ کر سکتے ہیں۔

اور یہ بھی یاد رکھو کہ حقیقی آگ تو جہنم میں ہے دنیا کی آگ تو نفع اور خیر کا سبب ہے اس آگ کا اصلی فائدہ تو یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان آخرت کی آگ کو یاد کرے جو کہ خدا کا غضب ہے دنیا کی آگ ہزاروں حجاب کے پیچھے اور کثیف ہے اس کے باوجود اس آگ کی معمولی سی چنگاری جو کہ چند لمحوں میں خاموش ہو جاتی ہے اگر کسی کے ہاتھ پر گر جائے تو اس کی چیخ نکل جائے اور اسکے جلنے کا اثر مدتوں تک باقی رہ جائے (تو جہنم کی آگ کا کیا عالم ہوگا) جب کہ جہنم کی آگ بسیط اور لطیف ہے واقعی دنیا کی آگ کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اس کی وجہ سے جہنم کی حقیقی آگ کو نہ بھولیں، گویا دنیاوی آگ جہنم کی آگ کے لئے تذکر اور یاد آوری کا ایک ذریعہ ہے۔

آتشِ دوزخ کے بارے میں روایات

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ معراج کی رات جو بھی فرشتہ مجھ سے ملا وہ مسکراتے ہوئے ملا لیکن ایک فرشتہ ایسا تھا جو بالکل نہ مسکرایا میں نے جبرائیل سے پوچھا یہ کون ہے، جبرائیل نے جواب دیا کہ یہ مالکِ دوزخ (دوزخ کے امور انجام دینے والا فرشتہ) ہے اسے جب سے خلق کیا گیا ہے یہ اسی طرح سے ہے اور کبھی بھی نہ مسکرایا، پیغمبرؐ فرماتے ہیں کہ میں نے جبرائیل سے کہا کہ اس سے کہو کہ جہنم کے بالائی حصے (چھت) کو ہٹائے، چھت کا کچھ حصہ ہٹایا گیا تو میںؐ نے دیکھا کہ آگ کے شرارے اوپر کی جانب بڑھ رہے ہیں اور میںؐ ڈرا کہ جہنم کے شعلے کہیں مجھے بھی اپنے

لپیٹ میں نہ لے لیں۔

پیغمبرؐ فرماتے جاتے اور گریہ کرتے جاتے تھے پھر اسی موقع پر یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی آگ ستر (۷۰) گنا آخرت کی آگ سے کمتر ہے اور آتشِ دوزخ ستر (۷۰) گنا زیادہ ہے(۱)

سحر میں نمازِ شب کے بعد صحیفہ سجادیہ (کاملہ) کو پڑھ کر دیکھو کہ امام سجادؑ کیا فرماتے ہیں اعوذبك من نارٍ نورها ظلمه "خدایا میں پناہ مانگتا ہوں اس آگ سے جس کی روشنی ہی اس کی تاریکی ہے" اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی آگ دنیا کی آگ سے مختلف ہوگی دنیا کی آگ میں روشنی ہوتی ہے جب کہ آخرت کی آگ میں تاریکی ہوگی۔

اس ضمن میں روایت بھی وارد ہوئی ہے کہ: آتشِ دوزخ کو ہزار سال تک جلایا گیا تو سفید ہوگئی پھر ہزار سال تک جلایا گیا تو لال ہوگئی اس کے بعد ایک ہزار سال تک مزید جلایا گیا تو سیاہ ہوگئی اور ابھی تک سیاہ ہے(۱)

صحیفہ سجادیہ کے دوسرے جملے میں امامؑ فرماتے ہیں کہ

ومن نارٍ یاکل بعضها بعضاً اور پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں اس آگ سے جن میں سے بعض آگ بعض دوسری آگ کو کھا لیتی ہیں۔

ومن نارٍ تذر العضام رمیماً ومن نارٍ لاتبقی علیٰ من تضرع الیها

---

(۱) بحار الانوار جلد (۳)

اور میں پناہ مانگتا ہوں اس آگ سے جو ہڈیوں کو گلا کر راکھ کردے گی واعوذ بك من عقاربها الفاغرة افواهها و حياتها الصالقه بانيا بها۔ خدایا میں پناہ مانگتا ہوں ان بچھوؤں اور ان سانپوں سے جو اپنے زہریلے ڈنکوں کے ساتھ جہنمیوں کو ڈسیں گے۔

﴿نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً﴾ اور ہم نے اس دنیا کی آگ کو آخرت کی آگ کے لئے یادآوری کا سبب قرار دیا خدا کرے کہ ہم اس آگ سے عبرت پکڑیں۔

حضرتِ امام جوادؑ کا گرم کھانے سے تذکر

بحارالانوار کی گیارویں جلد میں امامؑ کی حالاتِ زندگی کے ضمن میں مرقوم ہے کہ ایک روز امامؑ کی خدمت میں ایک برتن میں گرم گرم شوربہ رکھا گیا حضرتؑ نے اسے ہاتھ لگایا دیکھا گرم تھا تو اس وقت امامؑ نے فرمایا:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ النَّارِ کہ میں پناہ مانگتا ہوں جہنم کی آگ سے یعنی جب میں اس شوربے کی حرارت کو برداشت نہیں کرسکتا ہوں تو جہنم کی آگ کو کس طرح برداشت کرسکوں گا؟

اسی طرح ہم امام علیؑ کی داستان میں بھی پڑھتے ہیں کہ جب امام علیؑ اس عورت کے یتیم بچوں کے لئے روٹی پکا رہے تھے تو امامؑ جہنم کی آگ کو یاد کررہے تھے۔

---

(۱) بحارالانوار جلد (۲)

ہر جمعرات کو ہم دعائے کمیل میں پڑھتے ہیں کہ جہنم کی آگ وہ ہے جس کی تاب آسمان وزمین نہیں لاسکتے تو پھر میرا کیا حال ہوگا جبکہ میں ایک ضعیف، ناتوان، ذلیل اور محتاج بندہ ہوں۔

درس (۳۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴾

''ہم نے آگ کو (جہنم کی) یاددہانی اومسافروں کے فائدے کے واسطے پیدا کیا''

طنطاوی نام کا ایک مصری دانشمند بہت تحقیق کے بعد کسی امریکائی دانشمند کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: جو چیز انسان کو خاضع کرتی ہے وہ حیات ہے یعنی ہر چیز کو انسان علم طبیعات (physics) اور علم کیمیا (chemistry) کے ذریعے سے ایجاد کرسکتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ حیات کیسے وجود میں آتی ہے؟ ایک بیج جسے بویا جاتا ہے وہ کیسے ایک ہی دفعہ حرکت میں آجاتا ہے اور حیاتِ نباتاتی پیدا کرلیتا ہے اور اس کے لئے کوئی بھی علتِ مادی قابل تصور نہیں ہے لہذا اہل عقل اس مسئلے کے سامنے اپنے آپ سر تسلیم خم کرلیتے ہیں اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہئے۔

قرآن مجید کی (سورۃ حج (۲۲) آیت ۷۳) میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر

خدا کے سوا تمام لوگ جمع ہوجائیں اور چاہیں کہ ایک مچھر بنالیں تو نہیں بنا سکتے۔

(جب اسی طرح سے ہے) تو دیکھو کہ ہم نے عفار اور مرخ کے درخت کو تمہارے لئے یادآوری کا ذریعہ قرار دیا، جس سے تم عجیب انداز سے حیات کا مشاہدہ کرتے ہو۔

ان دو درختوں میں تضاد کا جمع ہونا ایک تذکر ہے

آتش کی طبیعت میں ہے کہ وہ اوپر کی جانب اٹھے جب کہ پانی کی طبیعت میں ہے کہ وہ نیچے کی جانب بہے اب اس درخت میں عجیب قدرت کارفرما ہے کہ یہ دو متضاد قوتیں اس درخت میں جمع ہوگئی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کو دفع کرتی ہیں پانی آگ کو ختم کرتا ہے جب کہ آگ پانی کو بخار کی صورت میں ختم کردیتی ہے لیکن دست قدرت کو دیکھیں اس نے ان دونوں قوتوں کو ایک ساتھ جمع کردیا ہے۔

آگ پانی کی نسبت لطیف اور نورانی ہے جب کہ پانی کثیف (مرکب) اور ظلمانی ہے یہاں پر نور اور ظلمت دونوں کو ایک جگہ پر جمع کردیا گیا ہے اور یہ تمام چیزیں تذکر اور یاددہانی ہیں۔

خدا کی اپنے بندوں پر عنایت

تذکر اور یاددہانی کے اسباب میں سے ایک عنایتِ پروردگار ہے اور ان دو

درختوں کی خلقت سے بخوبی معلوم چلتا ہے کہ خدا نے اپنے بندوں کی تمام احتیاجوں اور ضرورتوں کو پورا کیا ہے اور اپنے بندوں کو یوں ہی تنہا نہیں چھوڑا اور اس کی تمام ضروریات کو پورا کیا، یہاں تک کے سفر میں بھی جب انسانوں کو آگ کی ضرورت ہو تو ان کے لئے بیابانوں میں ان درختوں کو خلق فرمایا (کیوں کہ قدیم زمانوں میں ماچس نہ تھی) تاکہ مسافرین ان درختوں سے آگ حاصل کرلیں۔

آتش سے شیطان اور نفس کی یادآوری ہوتی ہے

مفسروں میں سے ایک اس نقطے کو بیان کرتے ہیں کہ جب انسان آگ کو دیکھے تو سبق سیکھے کہ شیطان بھی آگ سے خلق ہوا ہے اس نے حضرت آدمؑ کے سامنے خود کو بڑا سمجھا اور تکبر کرنے لگا اور کہنے لگا کہ تو نے مجھے آگ سے خلق کیا جب کہ آدم کو مٹی سے اور آگ مٹی سے افضل ہے یہ کہتے ہوے وہ راندہ درگاہ ہوگیا پس انسان آگ کو دیکھ کر سبق سیکھے اور کبھی تکبر نہ کرے۔

اسی طرح جب نفس کی آگ ابھارے اور انسان غصے کی حالت میں ہو تو اس کی آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں لہذا اس نفسانی آگ سے بھی بچنا چاہئے تاکہ غصے اور لالچ کی آگ انسان کو جلا نہ دے۔

آگ پیدا کرنے والے درخت مسافرین کے لئے زیادہ فائدہ مند ہیں۔

﴿ومَتَاعاً لِّلْمُقْوِينَ﴾ اور فائدہ ہے صحرا میں چلنے والوں کے لئے (اقوی) کا مطلب صحرا کی طرف جانا ہے اور مقوین کا معنی صحرا کی طرف جانے والے کے ہیں۔

شاید جتنی آگ کی ضرورت صحرا نشین کو محسوس ہوتی ہے اتنی ضرورت ایک شہری کو نہیں ہوتی خصوصا عرب کے اس علاقے میں جہاں صحرا بہت طویل ہوتے ہیں اور آبادی کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں چلتا وہاں آگ کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے اسی وجہ سے پروردگار نے خصوصیت کے ساتھ فرمایا کہ وَمَتَاعاً لِّلْمُقْوِينَ صحرا میں چلنے والوں کے لئے نفع بخش ہے اگرچہ دوسروں کے لئے بھی نفع بخش ہے لیکن ان صحرا نشینوں کے لئے کچھ زیادہ ہی فائدہ مند ہے یہ تو اس کا مادی فائدہ ہے جب کہ اخروی فائدہ اس سے تذکر اور یاددہانی حاصل کرنا ہے۔

مجمع البیان کے مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مقوین اضداد کے معنی میں ہے اور مناسبت کے ساتھ اغنیاء (امیروں) اور فقراء کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور آیت کا معنی کچھ اس طرح سے ہوگا کہ ہم نے اس کو فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا چاہے غریب ہوں یا امیر شہر میں رہتے ہوں یا صحراوں میں اسی طرح سردی میں اس کی گرمی

سے اندھیرے میں اس کی روشنی سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھو

اصلی مقصد آخرت کے لئے ہے اور دنیاوی فائدہ تو اس کے تابع ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس درخت کا اصلی فائدہ تذکر ہے اور ضمناً دو روزہ زندگی کے لئے بھی نفع بخش ہے۔

اب جب کہ تم نے افعال خدا کو سمجھ لیا، اپنے نطفہ ہونے سے لے کر بارش کی خلقت، ابر اور اسی طرح مرطوب درخت سے آگ کی خلقت کو جان گئے تو پھر تسبیح کرو اپنے پروردگار کے نام سے جو عظیم پالنے والا ہے (فسبح باسم ربك العظيم) اور کهو سبحان ربي العظيم و بحمده ـ سبحان الذي خلق السموات و الارض سبحان الذي سخر الشمس و القمر سبحان المنشيء السحاب الثقال)۔

اہم نقطہ جو کہ آیات کے ضمن تکرار کیا گیا وہ (فا) تفریع کے بارے میں ہے کہ وہ چیزیں جو تم نے جان لیں خدا کے بارے میں اس کے افعال کے بارے میں اور اس کی حکمتوں کے بارے میں تو بس خداوند متعال کی تسبیح کرو اور بس خلقت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان مومن معرفت کے ساتھ پیدا ہو خدا کی قدرت اور حکمت کو سمجھے اور کہے کہ سبحان اللہ۔ البتہ ایسا کرنے میں خود انسان ہی کا فائدہ ہے۔

کسان کا تسبیح کرنا تختِ سلیمان سے بڑھ کر ہے

بحارالانوار میں ہے کہ ایک روز حضرت سلیمان اپنے تخت پر سفر کر رہے تھے ایک کسان نے اپنی نظروں کو اوپر کی جانب اٹھاتے ہوئے کہا کہ سبحان اللہ پروردگار نے کیسی عظیم سلطنت داؤد کے فرزند کو عطا کی ہے۔

کسان کی صدا ہوا کے دوش پر حضرت سلیمانؑ کے کانوں تک پہنچی حضرت سلیمانؑ نے تخت کو کسان کے پاس اتر جانے کا حکم دیا، نیچے آنے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ اگر ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے کو خدا قبول فرمائے تو یہ اس سلطنت سے بہتر ہے۔

اس کا راز بھی معلوم ہے کہ مومن کا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے کا نور ثابت اور موجود ہوگا اور (وہ فنا ہونے والا نہیں ہے) اسی وجہ سے قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر تسبیح پڑھنے کا امر آیا ہے اسی طرح روایات اہل بیتؑ میں بھی یہی امر موجود ہے۔

تسبیح حضرت زہراؑ امتِ پیغمبر کے لئے ہدیہ ہے

صبح کی تسبیح پڑھنا اور اس کے بعد بلکہ ہر حال میں تسبیح پڑھنا بہتر ہے خصوصاً سوتے وقت تسبیح پڑھنے کے بارے میں روایت موجود ہے کہ اگر کوئی حضرت فاطمہ زہراؑ کی تسبیح پڑھے تو اس کا شمار اللہ کے ذاکرین میں ہوگا جیسا کہ خداوند متعال فرماتا ہے کہ (اے ایمان لانے والو اللہ کا ذکر زیادہ کیا کرو) (۱) اب اگر کوئی سوتے

---

(۱) سورہ ۳۳ آیت (۴۱)

وقت تسبیح حضرت زہراؑ کو پڑھے تو وہ مندرجہ بالا آیت کا مصداق قرار پائے گا امامؑ فرماتے ہیں کہ ہر نماز کے بعد تسبیح حضرت زہراؑ کو پڑھا کرو کیوں کہ وہ نماز جو تسبیح حضرت زہرا کے ساتھ ہو اس ہزار رکعت نماز سے بہتر ہے جس میں تسبیح نہ پڑھی گئی ہو(۱)

واقعی یہ تسبیح حضرت زہراؑ امت محمدیؐ کے لئے ہدیہ ہے جو کہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی برکت سے ہم تک پہنچی۔

تعقیباتِ نماز میں تسبیحات اربع کے عجیب اثرات

حضرت خاتم الانبیاءؐ سے مروی ہے کہ جو بھی شخص ہر نماز کے بعد تسبیحات اربعہ کو پڑھے گا تو خداوند کریم اسے ستر (۷۰) بلاؤں سے محفوظ رکھے گا۔

اوران بلاؤں میں سب سے آسان فقر کا دور ہونا ہے اور اگر کوئی پابندی کے ساتھ اس کو پڑھتا رہے تو خدا اسے جلنے سے، دب کے مرنے اور غرق ہو جانے سے بچائے گا (۲)

بحارالانوار میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جو نیکیوں کے پلڑے میں بہت بھاری ہوں گی (۱) سبحان اللہ (۲) الحمد للہ (۳) لا الہ الا اللہ (۴) اللہ اکبر اور پانچویں چیز اولاد صالح کی موت پر صبر کرنا ہے (۳) یعنی اگر کسی کا جوان بیٹا مر جائے اور وہ شخص صبر کرے تو اس کی نیکیوں کا

---

(۱) سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۵۹۳ (۲) سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۲۸۲

(۳) سفینۃ البحار جلد ۱ صفحہ ۲۸۲

پلڑا بہت بھاری ہوگا۔

دوسری روایت میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ وہ شخص بخشا جائے گا چاہے صبر کرے یا نہ کرے البتہ خدا رحیم ہے اور جس شخص کا دل جوان بیٹے کی موت سے داغدار ہو گیا ہو اسکے لئے لطفِ الٰہی کا مرہم موجود ہے۔

درس (۳۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ﴾

''اور پس تم اپنے پروردگار کی تسبیح کرو''

تفسیر مجمع البیان میں مذکور ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے فرمایا کہ رکوع میں ﴿سبحان ربیّ العظیم و بحمدہ﴾ اور سجدے میں ﴿سبحان ربیّ الاعلیٰ و بحمدہ﴾ کہا کرو۔

تسبیح پڑھنے کے بارے میں روایات میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، ہم تبرک کی خاطر کچھ روایات نمونے کے طور پر پیش کررہے ہیں۔

اگر روزہ اور انفاق نہیں ہے تو تسبیح کرو

کہتے ہیں سردیوں کے شروع میں منادی ندا کرتا ہے کہ اے لوگوں دن

گرمیوں کی نسبت چھوٹے ہوتے ہیں اور یہ روزہ رکھنے کے لئے بہت مناسب ہوتے ہیں اور راتیں بڑی ہوتی ہیں جو کہ شب داری و (عبادت) کے لئے موزوں ہیں اگر یہ دونوں نہ کرسکو تو بہت زیادہ ﴿سبحان اللہ والحمدللہ و لاالہ الااللہ واللہ اکبر﴾ پڑھا کرو(۱)

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں اگر انفاق (خرچ کرنا) کرنے میں بخل ہو اور راتوں کو عبادت کرنے سے بھی سہل انگاری کرتے ہو تو (کم از کم) ﴿سبحان اللہ والحمدللہ و لاالہ الااللہ واللہ اکبر﴾ پڑھنے سے بخل نہ کیا کرو(۲)

رسول خداؐ کسی باغ سے گزر رہے تھے، آپؐ نے دیکھا کہ ایک باغبان اپنے باغ میں شجرکاری کررہا تھا تو آپؐ نے اس سے فرمایا کیا میں تجھے اس درخت کے بارے میں بتاؤں کہ جس کا پھل اس درخت کی طرح وقتی اور محدود نہ ہو تو اس باغبان نے عرض کیا بتائیں وہ کونسا درخت ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ﴿سبحان اللہ والحمدللہ و لاالہ الااللہ واللہ اکبر﴾ کہنے سے تیرے لئے جنت میں دس درخت پیدا ہوں گے جو کہ ہر وقت پھل دیں گے۔(۳)

امام علیؑ فرماتے ہیں جو بھی ﴿سبحان اللہ﴾ کہے تو سارے فرشتے اس پر صلواۃ بھیجتے ہیں۔

حقیقت میں ﴿سبحان اللہ﴾ کہنے کی اہمیت ہے اور فقط زبان سے ادا

---

(۱) سفینۃ البحار جلد ۱ص ۶۸۲ (۲) سفینۃ البحار جلد ۱ص ۶۸۲ (۳) عدۃ الداعی ص ۲۲۸

کرنے سے معنوی منزلت حاصل نہیں ہوتی عمدہ تو یہ ہے کہ ہم حقیقتاً ﴿سبحان اللہ﴾ کہیں اور اس کے معنی کو بھی سمجھیں اور فقط زبان سے کہہ دینے سے وہ مطلوبہ اثرات حاصل نہیں ہوسکتے جو سمجھ کر کہہ دینے سے حاصل ہوسکتے ہیں البتہ زبانی کہہ دینا بھی خوب ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ جو صرف زبان سے ﴿سبحان اللہ﴾ کہہ دے اس کے لئے فرشتے درود بھیجیں بلکہ یہ حقیقت میں ﴿سبحان اللہ﴾ کہنے والوں کے لئے ہیں۔

ہمیں چاہئے کہ حقیقتِ امر کو خود حضرت امیرالمومنینؑ سے پوچھیں۔

ایک روایت کے مطابق حضرت عمر کے زمانہ میں ایک شخص مسجد رسول اللہؐ میں وارد ہوتا ہے اور حضرت عمر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ آپ جب حضرت رسول خداؐ کی جگہ پر بیٹھے ہیں تو مجھے بتائیں کہ ﴿سبحان اللہ﴾ کا کیا مطلب ہے جس کے پڑھنے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے بار بار پڑھا کرو۔

حضرت عمر حسب معمول ایسے مواقع پر حضرت علیؑ کے گھر کی طرف اشارہ کر دیتے تھے اور اس بار بھی انہوں نے ایسا ہی کیا اور کہا وہاں پر ایک ایسا مرد ہے جس سے جو سوالات بھی کرو وہ اس کا جواب دیتا ہے وہ سائل امام علیؑ کی خدمت میں آتا ہے اور عرض کرتا ہے میں نے حضرت عمر سے سوال پوچھا تھا تو انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کر دیا۔

امامؑ نے اس کے سوال کا جواب دو جملوں میں ادا کر دیا۔

تسبیح کا معنی حضرت علیؑ کی زبانی

﴿تعظیم جلال اللہ جل جلالہ و تنزیھہ عما لا یلیقُ بہ﴾

﴿سبحان اللہ﴾ یعنی ﴿رب العالمین﴾ کو بڑا اور بزرگ سمجھنا، ظاہری بادشاہ کا کس طرح احترام کرتے ہو، اور اس کے سر پر خاک ہو جو ظاہری سلطان کی نسبت حقیقی اور بزرگ بادشاہ (اللہ و تبارک و تعالیٰ) کا کمتر احترام کرے،

پس ﴿سبحان اللہ﴾ یعنی بزرگ جاننا اور اس کو ہر شرک سے پاک سمجھنا جس کا اہل شرک دعویٰ کرتے ہیں ان کو باطل سمجھتے ہو ﴿سبحان اللہ﴾ کہنا۔

﴿سبحان اللہ﴾ یعنی اسے پاک سمجھنا اس بات سے کہ وہ کوئی کام خلافِ حکمت نہیں کرتا اور یہ ایمان رکھنا کہ وہ کوئی لغو کام سرانجام نہیں دیتا، وہ کوئی ظلم نہیں کرتا وہ جو کام بھی کرے فائدے مند ہے۔

پس جو کوئی ﴿سبحان اللہ﴾ کہے اور اگر اس کا کوئی فرزند فوت ہو جائے تو فوراً اعتراض کرے کہ یہ کیا قضا و قدر الٰہی ہے؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حقیقت میں ﴿سبحان اللہ﴾ نہ کہا تھا بلکہ زبانی کلامی ہی کہا تھا اور اس نے ابھی تک خدا کو پاک نہ سمجھا تسبیح پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ہر کام پر راضی برضا رہے شیخ شوستریؒ اپنے موعظہ میں فرماتے ہیں کہ اے مومن کیا اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی تم نے صحیح طور پر ﴿لا الہ الا اللہ﴾ کہا ہے یا نہیں؟ یہ کہنے کے بعد اس کی توضیح فرماتے ہیں، قسم ہے کہ زندگی میں بہت کم لوگوں نے صحیح معنوں میں اور حقیقتاً ﴿لا الہ

الا اللہ﴾ کہا ہو، اکثر لوگ دولت پرست ہیں یا مقام پرست یا شہوت پرست، کم ہی
لوگ ہوں گے جو کہ خدائے وحدہ لاشریک کو اپنا معبود مانتے ہوں۔

بندہ یہاں عرض کرنا چاہتا ہے کہ ﴿سبحان اللہ﴾ بھی اسی طرح ہے یعنی
خدا پاک ہے اور کوئی عاجزی اس تک نہیں پہنچ سکتی ہے اور اگر تو تسبیح میں ﴿سبحان
اللہ﴾ کہتا ہے تو پھر تیرا توکل اور بھروسہ دولت اور بینک اور ظاہری دنیا پرستی پر کیوں
ہے؟ آیا خدا کے ساتھ خوش ہے یا ان اشیاء دنیاوی کے ساتھ واقعی اگر امتحان لیا جائے
تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک عمر تک یہ انسان جھوٹ بولتا ہوا آیا ہے کیا ہم دعائے کمیل
میں نہیں پڑھتے (لاتفضحنی بخفی مااطلعت علیه من سری) کہ خدایا تو اس
بات سے میرے اندر سے آگاہ ہے اور ان جھوٹ سے آگاہ ہے لیکن تو (انہیں آشکار نہ
فرما) اور مجھے رسوا نہ کر، جی ہاں خدا ہمارے تمام اعمال سے آگاہ ہے لیکن اسے اپنے
لطف و کرم سے چھپا لیتا ہے۔

آقا کی وجہ سے غلام کی خوشی

لوامع البینات نامی کتاب میں کسی بزرگ کے حالات زندگی کس طرح
تبدیل ہوئے ہیں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے یہاں بہت زبردست قحط پڑا اور لوگ
دانے دانے کو ترس گئے اور تنوروں میں نالے کی صدائیں بلند ہوتی تھیں اس وقت
میں نے ایک غلام کو دیکھا جو بہت خوش و خرم نظر آرہا تھا میں نے اس سے پوچھا کہ
سارے لوگ قحط سے پریشان ہو کر گریہ کر رہے ہیں لیکن تو بڑا خوش نظر آرہا ہے تو اس

نے مجھے جواب دیا کہ میں کیوں پریشان ہونے لگا میں ایک ایسے آقا کا غلام ہوں
جس کے پاس اتنا اناج ہے کہ جتنا چاہے مجھے عطا کر سکتا ہے۔

جیسے ہی میں نے یہ سنا مجھے عجیب سا محسوس ہوا اور میں نے اپنے آپ سے
کہا کہ کیا تم نے تمام عمر میں بھی ایک لحہ ایسا گزارا ہو کہ اپنے پروردگار کے وجود پر خوش
ہوئے ہو اسی طرح صدق دل سے تو نے امور عبودیت کو انجام دیا ہو؟

پس ﴿سبحان اللہ﴾ کا مطلب تمام شرک سے پاک سمجھنا اور تمام
امیدوں کو خدا سے وابستہ کر دینا ہے اور واقعی ایک دن بھی اگر خلوص دل اور حقیقت
میں کوئی ﴿سبحان اللہ﴾ کہے تو جنت کے درخت اور ملائکہ جو درود بھیجیں گے وہ اسی
کے لئے ہوں گے۔

درس (۳۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَلا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوم﴾

"میں تاروں کے منازل کی قسم کھاتا ہوں"

قسم کھانا مطلب کی تاکید

علمِ بلاغت میں ذکر ہوتا ہے کہ قسم کھانے سے مطلب میں تاکید پیدا ہوتی ہے اور جتنا مطلب و معانی اہم ہوگا اس کی تاکید بھی زیادہ ہوگی، تاکید کی مختلف قسمیں ہیں اس کا آخری مرتبہ قسم ہے جس میں زیادہ تاثیر پائی جاتی ہے۔

پروردگار نے قیامت کے مسئلہ پر بہت سے مطالب بیان کئے اور بہت سی آیات اور متعدد شواہد کا ذکر کیا، پانی کے بارے میں بیان کیا آگ کا ذکر فرمایا انسانی خلقت کو بیان کیا ان تمام شواہد کو بیان کردینے کے بعد پروردگار قسم کھا رہا ہے تاکہ

تاکید کامل ہوجائے۔

﴿فَلا اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوم﴾

مشہور مفسرین نے بیان کیا ہے کہ لا یہاں زائدہ ہے اور لا اقسم یعنی اقسم (میں قسم کھاتا ہوں) اس لحاظ سے لا اقسم یعنی میں حتماً قسم کھاتا ہوں۔

فخر الدین رازی نے احتمال بیان کیا ہے کہ (الف) لام میں زبر کے اشباع کرنے (کھینچنے) سے پیدا ہوگیا ہے اور اصل میں لاقسم تھا، اس مطلب میں دوسرے احتمالات بیان کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

جب خدا عظیم ہے تو اس کی مخلوق بھی عظیم ہے

ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن مجید ایک مطلب میں کئی معانی کو بیان کرتا ہے، مثلاً اسی مطلب (آیات) کو لیں کہ جس میں قسم کی وجہ سے تاکید ہے اس وجہ سے جس کی قسم کھائی جارہی ہے وہ بھی عظیم ہوگئی، جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ قسم اسی چیز کی کھائی جاتی ہے جو عظیم ہو جیسا کہ آپ اپنے محاورات میں کہتے ہیں کہ آپ کی جان کی قسم یہاں پر مخاطب کی جان آپ کے پاس عظیم ہے لہٰذا اسکی قسم کھائی گئی۔

پروردگار عالم بھی یہاں پر اپنے مخلوق کی قسم کھا کر اس کی عظمت کو بھی بیان کررہا ہے۔

مواقع: موقع کی جمع ہے جو جگہ اور محلِ وقوع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یعنی ﴿بِمَوَاقِعِ النُّجُوم﴾ یعنی ستاروں کی جگہ اور دوسرے الفاظ میں یعنی ستاروں کی

حرکت اوراس کے مدار۔

ستاروں سے آسمان پُر ہے ان میں سے اکثر زمین سے بڑے ہیں بلکہ بعض تو ہزاروں گنا زیادہ بڑے ہیں اور خدا کتنا عظیم عالم اور دانا ہے کہ جس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے ان کا راستہ اور ان کے لئے ہدف مقرر کردیا ہے کہ یہ کبھی بھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے اور (کل فی فلک یسبحون) اور اگر ان میں سے فقط دو بھی آپس میں ٹکرا جائیں تو عالم دنیا برباد ہو جائے۔

قیامت میں یہ عظیم دنیا بھی فناء ہو جائے گی اور یہی قیامت کبریٰ ہو گی اور خلاصہ کے طور پر کہ ستاروں کی جگہیں اور ان کی حرکات قابل توجہ اور عظیم ہیں اس لئے ان کی قسم کھائی جارہی ہے۔

ستاروں کا طلوع اور غروب ہونا قدرت کا کرشمہ ہے

دوسری وجہ۔ یہ ہے کہ بعض نے موقع۔ کا مطلب غروب ہونا لیا ہے اور ہر ستارہ آدھی رات سے غروب ہونا شروع ہو جاتا ہے البتہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے لیکن یہ زمین کی حرکت کی وجہ سے ہے۔

رات کے شروع میں ستارے چمکتے ہیں اور آدھی رات کے بعد ستارے آہستہ آہستہ غروب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور سحری کے وقت تک غروب ہو جاتے ہیں، ایک اہم نکتہ جس کو بعض مفسرین بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے ستاروں کا غروب ہو جانا ان کے زوال اور فناء کی طرف دلیل بن جاتا ہے اسی طرح

قرآن مجید اس بات کو حضرت ابراہیمؑ کے احتجاجات کے ضمن میں بیان کرتا ہے کہ یہ تمام عبادت کے لئے سزاوار نہیں ہیں اور ان کا خالق ہی عبادت کا مستحق ہے۔

رات کا آخری تین حصہ جو کہ سحر اور ستاروں کے ڈوبنے کا وقت ہوتا ہے

رات کا یہ حصہ عبادت کے لئے نہایت ہی فضیلت رکھتا ہے جس میں رحمت الٰہی کے دروازے کھلے رہتے ہیں رات کا یہ حصہ اس قدر اہم ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے جانشین حضرت علیؑ کو وقت رحلت وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے علیؑ تمہیں چاہئے نماز شب کے لئے بیدار رہو اگر چہ اتنی مقدار ہی کیوں نہ ہو جتنی مقدار میں گوسفند سے دودھ نکالا جاتا ہے۔ یعنی اے علیؑ آپ رات کو نماز شب اور مناجات کو ترک نہ کریں اگر چہ یہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں پھر اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس وقت کی دعا رد نہیں ہوتی۔ یہ وہ گھڑی ہے کہ جب یوسفؑ کے برادران کے لئے یعقوبؑ نے مغفرت کرنے کے لئے دعا کا وعدہ کیا (یوسف کے برادران جب رسوا ہو گئے تو انہوں نے حضرت یعقوبؑ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ضرور ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں) ﴿قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي﴾ کہ میں تمہارے لئے عنقریب طلب مغفرت کروں گا خدا نے اس وقت ارشاد فرمایا جب یعقوب کی دعا قبول کی گئی وہ سحر کا وقت تھا۔

حق کی آواز سحر میں اٹھنے والوں کے لئے

بحار الانوار میں بہت سی روایات ذکر ہوئی ہیں کہ ہر رات سحر کے وقت یعنی (رات کا تیسرا حصہ) منادی خداوند عالم کی طرف سے ندا دیتا ہے کہ کوئی ہے جو رحمت حق کی تلاش میں ہو جسے میں عطا کروں آیا تم میں سے کوئی ہے جو مغفرت مانگنے والا ہو، تا کہ اسے مغفرت دی جائے اور اے خیر کو طلب کرنے والو.. اور وائے ہو ان پر جو بدی کو طلب کریں (۱)

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سحر کے وقت دعا قبول ہوتی ہے اگر چہ بعض شرائطِ دعا نہ بھی ہوں پھر بھی یہ وقت قبول دعا کا ہے اور یہ ایسا وقت ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ اسے یاد کیا جائے۔ روایات میں ہے کہ وہ شخص گھاٹے میں ہے جو سحر کے وقت سو رہا ہو بیچ ہے کہ ایسا شخص فریب خردہ اور بے بہرہ ہے خداوند عالم ان لوگوں کی ستائش فرماتا ہے جو سحری میں بیدار ہوتے ہیں اور مغفرت طلب کرتے ہیں (۲)

بدن کی تندرستی اور تنگدستی سے دوری

امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ سحر میں اٹھنا بدن کی تندرستی اور سلامتی روح کا باعث ہے اسی طرح اس سے روزی میں اضافہ ہوتا ہے، امامؑ قسم کھا کر فرماتے ہیں وہ شخص جھوٹ بولتا ہے جو کہے کہ نماز شب پڑھتا ہوں لیکن دن میں کہے کہ خالی

(۱) عدۃ الداعی ص ۳۰ (۲) سورۃ ۱۵ آیۃ ۱۸

اور بیکار ہوں (۱)

کسی فقیر نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کی کہ میں پریشان حال ہوں امام صادقؑ نے اس سے فرمایا کہ رات میں اٹھ کر نماز شب پڑھ تا کہ محتاج نہ ہو اس نے امامؑ سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ نماز شب بھی پڑھتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص نماز شب پڑھتا ہو اور دن میں کہے کہ میں بیکار اور بے روزگار ہوں،

نماز شب قبر اور میزان کے لئے نور ہے (۲)

جو لوگ بڑھاپے کی وجہ سے ذکر خدا کرنے کے لئے بستر کو نہیں چھوڑ سکتے ان کے لئے بھی روایات موجود ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب برتن میں اس ہاتھ یا اس ہاتھ کو دھوتے ہو تو یا اللہ، یا رب کہتے رہو اور یاد خدا کو ترک نہ کرو اگر چہ مختصر ہی کیوں نہ ہو لیکن اسے ترک نہ کرو۔

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایک سال تک نماز شب پڑھتا رہے اور وتر کے قنوت میں ستر مرتبہ (استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ) کہے تو ایسا شخص مستغفرین میں سے ہوگا اور ایسا بندہ اللہ کا پسندیدہ بندہ ہوگا (۳)

اے خدا ہمیں توفیق عنایت فرما تا کہ اپنی زندگی سے بہرہ مند ہو سکیں زینب سلام اللہ علیہا نے بھی نماز شب ترک نہ کی حتیٰ کہ شام کے زندان میں اسی طرح راستے میں بھی نماز شب پڑھتی رہیں۔ امام حسینؑ نے ان سے سفارش کی تھی کہ جب وہ سحر میں نماز شب کے لئے اٹھیں تو انھیں بھی یاد کر لیں (۴)

(۱) لئالی الاخبار ص ۳۰۱ (۲) لئالی الاخبار (۳) تفسیر برہان (۴) ریاحین الشریعہ

درس (۴۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَ اِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ﴾

''میں تاروں کے منازل کی قسم کھاتا ہوں اور اگر تم سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے''

دوسری وجہ جو کہ ﴿فَلَآ اُقْسِمُ﴾ کے لئے بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ لا نفی ہو لیکن اس کا متعلق ذکر نہ ہوا ہو، پس معنی اس طرح سے ہوگا کہ فلا یعنی اس طرح سے نہیں ہے جس طرح تم خیال کرتے ہو پھر ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ قسم کھاتا ہوں ستاروں کی جگہ اس صورت میں فلا پہلے جملے کے ساتھ مربوط ہوگا اور دوسرا جملہ ﴿اُقْسِمُ بِمَوَاقِعَ النُّجُوْمِ﴾ مستقل جملہ ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ لا نافیہ ہو لیکن جملہ مربوط ہو تو مطلب اس طرح سے ہوگا ﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ کہ میں قسم نہیں کھاتا ہوں کیوں کہ مطلب واضح اور آشکار ہے اس کے لئے قسم کھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ ہم بھی

اپنے محاورات میں اسی طرح استعمال کرتے ہیں لیکن جب بات بہت واضح ہو تو کہتے ہیں کہ اس میں تو قسم کھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مواقع کے بارے میں بھی ہم نے بیان کیا ہے کہ ایک معنی مساقط یعنی سقوط اور غروب ہونے کی جگہ، پس معنی ﴿مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ ہوا۔

شیخ طوسیؒ اور شیخ طبرسیؒ نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ ﴿مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ سے مراد خود قیامت ہو۔

مطلب کے ثبوت کے لئے بڑی قسم ﴿وَ اِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ﴾ اور یہ قسم جو بیان) (ہوئی ہے) اگر تم جان لو تو بہت بڑی ہے یعنی ہم نے تمہارے لئے ﴿مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ کی قسم کھائی ہے جو کہ بہت بڑی قسم ہے۔

﴿لَوْ تَعْلَمُوْنَ﴾ میں احتمال ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہو اور اس کا جواب محذوف یا متروک ہو اس لحاظ سے معنی اس طرح ہوگا کہ اگر تم جان لیتے کہ یہ بہت بڑی قسم ہے تو تم اس سے بہرہ مند ہوتے اور خدا سے ڈرتے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ آیت کا معنی ظاہری آیت کے مطابق ہی ہو اور کچھ محذوف نہ ہو پھر معنی اس طرح سے ہوتا کہ اگر تم جانتے کہ کتنی بڑی قسم ہے (لیکن تم تو نہیں جانتے)

واقعی ستاروں کے مواقع کی قسم بہت بڑی قسم ہے کیونکہ ہزاروں ستارے عالم میں موجود ہیں اور اپنے اپنے مداروں پر حرکت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی

کے درمیان تصادم نہیں ہوتا۔

گذشتہ بحثوں میں آپ نے جان لیا کہ قرآن وہ جامع کتاب ہے اور اس کے بہت سے مصادیق ہیں اور روایت میں اس کے لئے ستر بطن (پردے) یا سات پردے کی تعبیر ہوئی ہے۔

آیت شریفہ میں نجوم کے لئے بھی بہت مصادیق ہو سکتے ہیں ان مصادیق میں سے ہم بعض کی طرف بعد میں اشارہ کرتے ہیں۔

قرآن کا نزول محمدؐ کے دل پر

النجوم کے مصادیق میں سے ایک آیات قرآنی ہیں کیونکہ حقیقی ستارہ خود قرآن ہے جس کا علم اور ادراک دل کو منور کرتا ہے اب اس کے مواقع میں سے شریف اور مقدس ترین جگہ جس تک اوّلین اور آخرین میں سے کوئی بھی نہ پہنچ سکا وہ قلب حضور اکرمؐ ہے جس کے بارے میں سورۂ حجر میں تصریح ہوگئی ہے۔

دوسرے مرتبے پر اہل ایمان کا دل ہے جو کہ پیغمبرؐ کے آیات کے پڑھنے کے بعد خاشع اور متاثر ہو جاتا تھا اور ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

اہل بیت علیہم السلام حقیقی ستارے ہیں

جیسا کہ بحار الانوار کی ساتویں جلد سے پتہ چلتا ہے (جس میں ۲۰ سے زیادہ حدیثیں اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں) حقیقی ستارے سے اہل بیت (علیہم

السلام) یعنی بارہ امامؑ کے انوار مراد ہیں۔

﴿وعلامات و بالنجم هم يهتدون﴾ مذکورہ آیت کے ضمن میں روایت ہے کہ علامات سے مراد علیؑ اور ان کی گیارہ اولادیں ہیں جب کہ ستارے سے مراد خود رسول عربیؐ کی ذات گرامی ہے اسی طرح ﴿والشمس﴾ یعنی محمدؐ ﴿والقمر﴾ یعنی علیؑ کی ذات مراد ہے۔

اسی طرح اہل سنت سے بھی روایات نقل ہوئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت (علیہم السلام) آسمان نبوت کے ستارے ہیں۔

رسول خداؐ سے ایک دلچسپ حدیث

امالی میں شیخ طوسیؒ، جابر ابن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کرتے ہیں، جابر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک روز صبح کی نماز رسول خداؐ کے ساتھ پڑھی نماز تمام کرنے کے بعد آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ جب بھی تم آفتاب کو نہ پا سکو تو مہتاب کی روشنی سے استفادہ کیا کرو اور جب مہتاب کو بھی نہ پا سکو تو دو ستاروں سے نور حاصل کیا کرو جابر کہتے ہیں کہ میں کھڑا ہوا اور عرض کی کہ آفتاب سے آپؐ کی کیا مراد ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ آفتاب میں خود ہوں اور خداوند عالم نے ہمیں ستاروں کی طرح قرار دیا ہے جب ایک ستارہ غروب کرتا ہے تو دوسرا ظاہر ہو جاتا ہے یعنی کسی وقت بھی فضاء خالی نہیں ہوتی۔

میں نے پھر عرض کی کہ چاند سے آپؐ کی کیا مراد ہے آپؐ نے فرمایا کہ میرے جانشین اور بھائی علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔

میں نے پھر پوچھا کہ دو بڑے ستارے کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا حسنؑ اور حسینؑ پھر کچھ دیر بعد فرمایا کہ یہ اور میری فاطمہؑ میری عترت ہیں یہ کبھی قرآن سے جدا نہ ہوں گی یہاں تک حوض کوثر پر مجھ سے آکر ملیں (۱)

ان کے بدن مواقع اور ان کی قبریں شیعوں کے دل ہیں میری نظر میں اس تشبیہ کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ نجوم بشر کی راہنمائی کرتے ہیں اور مسافرین نجوم کی برکتوں سے اپنی منزلوں تک پہنچتے ہیں اور یہ دریاؤں اور صحراؤں میں سفر کرنے والوں کے لئے ہدایت ہیں یہ زمین کو بھی منور کرتے ہیں۔

جب کہ ہدایت کی حقیقی نشانی آل محمد کی ذات ہے جو کہ حقیقی نجوم ہیں۔

﴿مَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ قسم ہے کہ جہاں پر ان چہاردہ معصومین کا نور ہے وہی مواقع ہیں اور ایک مرتبہ مواقع ان کے بدن مبارک ہیں اور دوسری مرتبہ ان کی مزار اور قبریں ہیں اور اسی طرح شیعوں کے دل بھی نجوم ہدایت ہیں جو کہ دن سے بھی زیادہ روشن تر ہیں۔

ان عظیم ہستیوں (اہل بیتؑ) کی ارواح کی جگہ عرش عظیم الٰہی ہے جیسا کہ روایت میں ہے کہ میرے جد حضرت حسینؑ عرش اعظم پر ہیں اور ان کی نظر مبارک مجلس عزا اور اپنی قبر کی زیارت کرنے والوں پر ہے۔

دوسرے ﴿مَوَاقِعِ النُّجُومِ﴾ سے مراد ائمہؑ کی قبور مطہر ہے جہاں پر یہ ہدایت کے ستارے اترے ہیں اور جہاں پر معصومؑ کا بدن ہوگا وہ زمین (جگہ) الشرف الشریف ہوگی، خصوصاً کربلائے معلیٰ کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ یہ کعبہ سے شرافت میں برتر ہے اور خدا نے اسے پناہ گاہ قرار دیا ہے۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۷ ص ۱۳۲

رسول خداؐ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ کربلا، ملائکہ کی آمد و رفت کہ جگہ ہے (۱)

حیرت کی بات ہے کہ حیوان بھی اس بات کو ایک حد تک محسوس کرتے ہیں، بہت سی داستانیں آپ نے سنی ہوں گی کہ بہت سے حیوانوں نے آپؑ کی قبر پہ پناہ لی ہے۔

جی ہاں بلکہ یہ زمین رب العالمین کی مورد نظر ہے بلکہ بعض گذشتہ پیغمبروں کی مدد سے آمادہ ہو چکی ہے جیسا کہ حضرت امیر المومنینؑ کے دفن کے قصے میں ہم پڑھتے ہیں۔

حضرتؑ نے اپنے بڑے بیٹے امام حسنؑ کو وصیتوں کے ضمن میں فرمایا کہ میرے تابوت کو پیچھے سے تم اور حسینؑ بلند کرنا جب کہ آگے سے اس کو جبرائیل اور میکائیل اٹھائیں گے اور جہاں پر یہ نیچے اترے وہیں پر میری قبر ہوگی اور مجھے وہیں پر دفن کرنا، جب دیکھا تو اسی جگہ پہ قبر تیار ہو چکی تھی۔

---

(۱) خصائص شیخ شوستری

درس (۴۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اِنَّهُ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾

"بیشک یہ بڑے رُتبے والا قرآن ہے"

قرآن مجید کریم کی طرف سے آیا ہے

قسم (جو کہ گذشتہ بحث میں کھائی گئی تھی) ایک اہم مطلب یعنی قرآن کریم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قرآن کریم جو کہ حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفےٰ کی رسالت کا ثبوت ہے اور ان کا اثبات کرتا ہے جو کہ ان پر نازل ہوئے اب آپ توجہ کریں کہ یہ قسم کس چیز کے لئے کھائی جارہی ہے ﴿اِنَّهُ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ کہ یہ قرآن کریم ہے اس بات کے لئے قسم کھائی جارہی ہے قرآن، خداوند کریم کی طرف سے ہے اور یہ خود بھی کریم ہے البتہ اس قرآن کی کرامت خدا کے کریم ہونے سے ہے اور

خدا کا کرم اس میں بھی ظاہر ہے۔

قرآن مجید کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ جو بھی اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہے اسے مایوس نہیں کرتا اور انسان کسی نہ کسی طور سے اس سے بہرہ مند ہوتا ہے البتہ ہر شخص کا فائدہ حاصل کرنا اس کی استعداد پر منحصر ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی ساری مشکلیں حل کرنا چاہتے ہیں اپنے پیٹ کو سیر کرنے کے لئے یا سرمایہ طلب کرنے کے لئے اس کے پاس آتے ہیں تو قرآن کی سورتیں اس کے لئے بھی نافع اور مجرب ہیں جیسے کہ یہی (سورۂ واقعہ) (جس سے ہم بحث کررہے ہیں) رزق میں وسعت کا سبب ہے اگر چہ قرآن مجید کی شان اس بات سے کہیں بڑھ کر ہے کہ اسے مادی فوائد حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے لیکن بہرحال یہ مادی فائدہ پہنچانے کا بھی سبب ہے اگر چہ انکی اصلی غرض معارف الٰہی ہیں لیکن ضمناً مادی فوائد بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔

اسی طرح (سورۂ الحمد) جو کہ (خود ہی مختصر سا قرآن ہے) یہ (سورۂ الحمد) بیماری سے نجات اور شفاء کے لئے مجرب ہے اگر سات مرتبہ یا ستر مرتبہ اسے کسی مریض کے سرہانے پڑھا جائے تو وہ شفایاب ہوجاتا ہے اگر مخص مؤمن ہو تو، اور اعتقاد کے ساتھ اس کو پڑھے اور قرآن کی عظمت کو ملحوظ خاطر رکھے ہاں اگر اس کے پڑھنے سے فائدہ نہ ہو تو قصور پڑھنے والے کا ہے یا پھر موت حتمی ہوگئی ہے اور اس سے چھٹکارہ ممکن نہیں ہے۔

قرآن کریم کے کرم پر ایک جالب داستان

کتاب (فرج بعد الشدۃ) میں کسی موثق (معتبر) آدمی سے نقل ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں زندان (قید) میں تھا، اس وقت مجھے یاد آیا کہ اگر کوئی قیدی سورۃ (واللیل) اور (والضحیٰ) کو سات مرتبہ پڑھے تو خواب میں اسے رہائی کی راہ کی اطلاع مل جائے گی (جب کہ بعض لوگوں نے اس کو سات رات پڑھنے کے لئے کہا ہے)

قیدی بیان کرتا ہے کہ میں نے اسے پڑھا مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ تیری رہائی فلاں شخص (ابراہیم) کے ہاتھ میں ہے میں اسے پہچانتا تھا لہٰذا اس سے کہہ کر رہائی پا گیا۔

پھر کچھ مدت کے بعد مریض ہو گیا اس طرح کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا، پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ قرآن مجید سے توسل حاصل کروں، میں نے سورۃ الشریف الحمد کو پڑھا (اس رات) دو بزرگوں کو خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو میرے بدن پر پھیر رہے ہیں یہاں تک کہ میرے سر تک پہنچ گئے اور پھر فرمایا کہ اس سر کی حجامت کراؤ(۱)

ان میں سے دوسرے نے کہا کہ اگر تو ان دو سوروں کے ساتھ (سورۃ والتین) کا اضافہ بھی کرلے، میں جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ تمام بدن ٹھیک ہو چکا تھا اور اس جگہ کی جہاں کے بارے میں حجامت کرنے کے بارے میں کہا گیا تھا وہ

---

(۱) حجامت یعنی جسم کے کسی حصے کا فاسد خون نکالنا (مترجم)

حجامت کرنے کا محتاج تھا۔

قرآن سے شفاء حاصل کرنے کا عقیدہ ضعیف ہو چکا ہے

حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ اگر (سورہ الحمد) سے شفاء حاصل نہ ہو سکے تو پھر کس چیز سے شفا مل سکتی ہے(۱)

لوگوں کا عقیدہ ضعیف ہو چکا ہے وہ جتنا اعتماد دوا اور ڈاکٹر پر کرتے ہیں اتنا قرآن پر نہیں کرتے۔

قرآن مجید کی خاصیت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اسے پڑھا جائے اس کی خواہش ہے کہ اس سے مانگا جائے تا کہ عطا ہو، غرض کہ کوئی ایسی حاجت نہیں ہے جو کہ قرآن سے توسل کرنے سے پوری نہ ہوئی ہو اس کے کریم ہونے کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے ثواب ملتا ہے۔

قرآن پڑھنے کا زیادہ ثواب ہونا قرآن کا کرم ہے

اگر قرآن کو ثواب کی خاطر پڑھو تو یہ بھی ملتا ہے اگر بغیر وضو کے پڑھو تو (۱۲) بارہ نیکیاں اگر وضو کے ساتھ پڑھو تو (۲۵) پچیس نیکیاں ملیں گی اور اگر نماز میں پڑھو اور بیٹھ کر پڑھو تو ہر حرف کے عوض (۵۰) پچاس نیکیاں اور اگر کھڑے ہو کر پڑھو تو

---

(۱) لئالی الاخبار

ہر حرف کے بدلے (۱۰۰) سو نیکیاں ملیں گی۔

حضرت صادق فرماتے ہیں کہ یہ ثواب حرف کی وجہ سے ہے کلمہ کی وجہ سے نہیں ہے مثلاً الم میں تین حرف ہیں اس لحاظ سے تین ثواب ملے گا۔

اگر کوئی شخص ہدایت کا متلاشی ہو تو اس تک پہنچ سکتا ہے اسی طرح اخلاق، احکام، معارف، آداب معاشرت اور معاملات اور موعظہ سب کچھ اس میں ہے، قرآن وہ کتاب ہے کہ اگر پہاڑوں پر پڑھی جائے اور وہ انسانی شعور بھی رکھتے ہوں تو وہ ایسے پہاڑ بھی نرم پڑ جائیں (۱)

دلوں کی جلاء اس میں ہے بیماریوں سے نجات اس کے ذریعے سے ہے اسی طرح رزق میں برکت غموں سے نجات، اسی طرح اور بہت سے امور اسی قرآن کی برکت سے حاصل ہوتے ہیں۔

آیت الکرسی کے عجیب اثرات

نمونے کے طور پر آیت الکرسی کے اثرات پر توجہ کریں ہر شخص اپنی ہمت اور ہدف کے اعتبار سے اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے، اگر چہ کوئی حفاظت کے لئے اس کو پڑھے تو خدا ایک فرشتے کو اس قاری کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیتا ہے، اسی طرح درد کے لئے پڑھا جائے یا حیوانوں کے شر سے بچنے کے لئے تو فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں اگر یہ دو دفعہ پڑھی جائے تو دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں اسی طرح اگر پانچ مرتبہ پڑھی جائے تو ندا آتی ہے کہ اے فرشتوں اس بندے کو میری

(۱) سورۃ حشر آیۃ ۲۱

پناہ میں لے آؤ ﴿فَاللّٰهُ خَیْرٌ حَافِظًا﴾ کہ اللہ بہترین حفاظت کرنے والا ہے اسی طرح چور سے بچنے کے لئے رات میں سونے سے پہلے پڑھنا بہت ہی مؤثر ہے، اسی طرح اگر پڑھنے والے کی غرض یہ ہو کہ وہ شیطان کے شر سے محفوظ رہے تو گھر سے نکلنے اور داخل ہونے سے قبل اس کو پڑھے۔

اگر آیت الکرسی کے پڑھنے کا مقصد ثواب ہو تو اس کے بارے میں ہم آپ کے سامنے تفسیر منہج کو یاد آوری کرتے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

اگر کوئی قبرستان میں جائے اور آیۃ الکرسی کو پڑھے اور اس کا ثواب مردے کو ہدیہ کرے تو چاہے کسی مؤمن یا مومنہ کی قبر مشرق میں ہو یا مغرب میں اس کی قبر میں ایک نور ساطع ہوگا اور میت سے کہا جائے گا کہ تیرے فلاں شخص نے آیۃ الکرسی کا یہ ہدیہ کیا ہے اور اس سے اس نے خود بھی بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے کہ اس کے لئے آیۃ الکرسی پڑھنے کے عوض اس کے ہر حرف سے جو کہ پچھتر (۷۵) حرف ہیں فرشتے کو خلق کیا گیا ہے تا کہ وہ اللہ کی تسبیح کرتے رہیں اور اس کا ثواب اس قاری کے حق میں جائے گا۔

یہ سب نمونے قرآن کے کرزم کے سلسلے میں نقل کیئے گئے۔ خدا کرے کہ انسان معنوی امر کا طالب ہو، علم، معرفت، ایمان یہ سارے عمدہ اثرات ہی زندہ آدمی کے لئے ہیں نہ یہ کہ صرف قرآن کو مردوں اور قبروں پر ہی پڑھا جائے۔

قرآن سے شفاء طلب کرنے کے نمونے

ایک شخص حضرت امام جعفر صادقؑ سے سوال کرتا ہے کہ مولیٰ میں مدتوں سے بخار میں مبتلاء ہوں امام صادقؑ نے اس سے کہا کہ اپنے گریبان کو کھول اذان و اقامت کہنے کے بعد اس پر سات مرتبہ (سورۃ الحمد) پڑھ اور دم کر شفاء مل جائے گی اس نے اسی طرح کیا اور وہ شفاء یاب ہوگیا۔

سید جزائریؒ نے لکھا ہے کہ جب مامون روم کی طرف حرکت کر رہا تھا تو اسے عجیب قسم کے سر کا درد لاحق ہوگیا اور جتنے طبیب اس کے پاس تھے ان سے معالجہ کروایا لیکن بے سود رہا پھر اس نے قیصر روم کے پاس کہلوا بھیجا کہ آیا تیرے پاس کوئی اس درد کا علاج ہے قیصر روم نے اس کے لئے ایک ٹوپی روانہ کی مامون ڈر گیا کہ کہیں اس ٹوپی میں زہر نہ ہو جو کہ سر کے ذریعے جلد تک سرایت کر جائے اور اس کی موت واقع ہو جائے اس لئے اس نے پہلے ٹوپی لانے والے کو پہنایا جب اسے کچھ نہ ہوا تو ایک ایسے شخص کو پہنایا جو کہ سر کے درد میں مبتلاء تھا اس کا درد فوراً رخصت ہوگیا پھر جب مامون کو اطمینان ہوگیا کہ اس میں زہر نہیں ہے تو خود اسے ٹوپی کو پہنا اس کا درد بھی ختم ہوگیا، مامون بہت حیران ہوا کہ آخر اس ٹوپی میں کیا عجیب بات ہے لہذا مامون نے حکم دیا کہ اس ٹوپی کو چاک کر کے دیکھا جائے کہ اس میں کیا ہے ٹوپی کو شگافتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ایک رقعہ ہے جس پر لکھا ہوا ہے۔

﴿بسم اللہ الرحمن الرحیم و کم نعمة لله فی کل عرق ساکن

حمعسق لا یصدعون عنها ولا ینزفون و بکلام الرحمن یخمد النیران ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلی العظیم﴾

اس وقت معلوم ہوگیا یہ عجیب اثر ﴿بسم اللہ﴾ کی برکت ہے اور یہ اس لکھنے والے کا عمدہ اعتقاد اور اثر تھا۔

سید مرتضیٰؒ کے حالات زندگی میں مرقوم ہے کہ ان کا ایک شاگرد تھا جو کہ بغداد سے کاظمین سید مرتضیٰؒ کے درس میں شریک ہونے کے لئے آتا تھا ایک روز اس شاگرد نے سید مرتضیٰؒ سے شکایت کی کہ آپ کے درس میں آنے کے لئے مجھے بڑی زحمت ہوتی ہے اور درمیان میں جو دجلہ پڑتا ہے اس کی وجہ میں آپ کے درس میں تاخیر سے پہنچتا ہوں، سید مرتضیٰؒ نے اس شاگرد کو ایک رقعہ لکھ کر دیا اور کہا کہ کل صبح اسے تو دریا کے پانی پر مار اور آرام سے چلا آ، صبح جب شاگرد نے ایسا کیا تو آرام سے پانی کے اوپر سے چلا آیا ایک مرتبہ اس شاگرد نے خیال کیا یہ تو حضرت عیسیٰ ابن مریم کی صفت ہے آیا اس رقعہ کو دیکھا جائے کہ اس میں کیا لکھا ہے جب اس رقعے کو کھولا تو اس میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لکھا ہوا پایا تو اس نے کہا کہ وہ یہ تو وہی ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ ہے جسے میں پڑھتا ہوں اب جب دریا پر پیر مارا تو دریا سخت نہ ہوا بس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو لکھنے اور پڑھنے والے کا بہت اثر ہے۔

درس (۴۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فِی کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ﴾

''لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے کہ اسکو بس پاک لوگ چھوتے ہیں''

دوسری صفت جو کہ قرآن کی ذکر کی گئی ہے وہ ﴿فِی کِتَابٍ مَّکْنُوْنٍ﴾ مکنون کا مطلب ایسی چیز جو بالکل نئی ہو اور اس تک سب کی رسائی نہ ہو شاید قرآن کو مکنون کہنے کی ایک وجہ یہ ہو کہ مکنون یعنی لوح محفوظ۔

چونکہ قرآن پہلے لوح محفوظ پر ثبت ہوتا تھا بعد میں تدریجاً قلب پیغمبر حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیؐ پر ۲۵ سال کے عرصے میں نازل ہوا پس شروع میں قرآن سے دوسرے لوگ غیر مطلع تھے۔

﴿لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ﴾ اس لوح محفوظ کو کوئی مس نہیں کر سکتا سوائے ان لوگوں کے جنہیں پاک کیا گیا ہے یعنی ملائکہ اگر چہ سب ملائکہ پاک ہیں

لیکن ان میں سے بھی پاکیزہ ترین ملک اس تک پہنچ سکتا ہے۔

قرآن تمام تحریفات سے محفوظ ہے

دوسری وجہ جو مکنون کی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ قرآن کے تمام الفاظ و حروف دوسرے لوگوں کی تحریفات سے محفوظ ہیں اور کوئی بھی اس میں خیانت نہیں کر سکتا، اور آج تک کوئی بھی اس میں نہ اضافہ کر سکا ہے اور نہ کر سکے گا یہ قرآن کا ایک معجزہ ہے۔

اگر چہ یہ جملہ خبر کے طور پر ذکر ہوا ہے لیکن جمہور کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کا مطلب یہی ہے جیسا کہ اس آیت میں ﴿والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء﴾ کہ وہ عورتیں جنہیں طلاق دی گئی ہے وہ عدہ رکھیں گی لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عدہ رکھیں اسی طرح ﴿لَّا یَمَسُّہٗٓ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ﴾ میں بھی یہ ہے کہ وہ مس نہیں کرتے لیکن معنی یہ ہوگا کہ وہ مس نہیں کر سکتے مگر وہ لوگ جو پاک ہوں۔

بُرے لوگ قرآن کے باطن سے مستفید نہیں ہو سکتے

جیسا کہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے ظاہری الفاظ و خطوط، اور نقوش کے علاوہ باطن بھی ہے جو کہ ستر (۷۰) بطن ہیں اور ہر جملہ کے مختلف معنی ہیں، اسی طرح انسان بھی دو پہلو رکھتا ہے ایک ظاہری دوسرا باطنی جس طرح انسان ظاہری قرآن کو بغیر باطنی طہارت کے مس نہیں کر سکتے اسی طرح باطنی قرآن جوان افراد کے لئے ہیں کہ جو واقعی پاک ہیں بس وہ لوگ جو اخلاق رزیلہ کا شکار ہیں سر سے

ہیں تک غرور، تکبر، حرص اور نفاق میں ڈوبے ہیں وہ حقیقتِ قرآن تک رسائی نہیں پا سکتے۔

قرآن کا احترام ہر حال میں لازم ہے

فقہی لحاظ سے قرآن کے الفاظ و حروف کو بغیر وضو کے مس کرنا حرام ہے چاہے یہ مس کرنا صرف ہاتھ رکھنے یا اسے چومنے، یا اسی طرح بدن کے کسی حصے سے لگانے کے لحاظ سے ہو، حرام ہے، اسی طرح ان اعضاء سے مس کرنا جن اعضاء میں حیات (روح) نہیں ہے احتیاط یہ ہے کہ ترک کیا جائے اور بغیر وضو کے مس نہ کیا جائے، اگر کوئی شخص مس کرنے کے بعد محدث ہو گیا ہو مثلاً ہاتھ رکھے رکھے اسے نیند آ گئی ہو تو جب وہ بیدار ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنا ہاتھ قرآن کے الفاظ سے ہٹا لے، لیکن قرآن کے ترجمے کو، اس کی تفسیر کو بغیر وضو کے مس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن خدا کے اسماء کو خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہوں مس کرنا ممنوع ہے۔

البتہ قرآن کی جلد، حاشیئے اور خالی جگہوں کو مس کرنا حرام نہیں ہے لیکن مکروہ ہے اور ادب کے خلاف ہے بلکہ بغیر طہارت کے قرآن کا اٹھانا بھی مکروہ ہے، اسی طرح ایسی جگہوں پر لے جانا کہ جو مناسب نہیں ہیں اگر قرآن کی بے حرمتی نہ ہو رہی ہو تو مکروہ ہے اور اگر بے حرمتی ہو رہی ہو تو حرام ہے، مثلاً قرآن کا بیت الخلاء میں لے جانا، اگر خدانخواستہ گر جائے تو اسے ہر قیمت پر نکالنا چاہئے اور اگر اس کا نکالنا ممکن نہ ہو تو اس کو بند کر دینا چاہئے اور دوسری جگہ کو استعمال کرنا چاہئے۔

ایسے بچے کو قرآن نہیں دینا چاہئے جو ممیز (سمجھدار) نہ ہو مثال کے طور سے دو، یا تین سال کے بچے کو قرآن نہیں دینا چاہئے ہاں اگر بچہ ممیز ہو تو کوئی مانع نہیں ہے اور اس کا بغیر وضو کے مس کرنا بھی حرام نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف نہیں ہے لیکن بہتر ہے کہ کوئی کاغذ کی نوک یا کوئی چیز ہاتھ میں دی جائے جیسے کہ پہلے زمانے سے یہ رسم چلی آ رہی ہے اور اچھی رسم بھی ہے کہ بچے کو کوئی لکڑی یا کاغذ کی نوک پکڑا دی جاتی تھی تا کہ بچے کا ہاتھ قرآن کے حروف سے مس نہ ہو سکے اسی طرح اگر قرآن کو کسی شیشے کے نیچے رکھ کر شیشے کے اوپر سے یا باریک کاغذ یا (پلاسٹک کی کوٹنگ) رکھ کر اس پر سے مس کیا جائے تو بھی حرام نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں قرآن کے حروف کا مس کرنا لازم نہیں آتا۔

امام حسینؑ قرآن ناطق ہیں

شیخ شوستریؒ اپنی کتاب خصائص میں فرماتے ہیں کہ قرآن کی طرح امام حسینؑ کی بھی خصوصیات ہیں، جس طرح قرآن مجید کے زیادہ پڑھنے سے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی اور اس کے پڑھنے سے وہ پرانا نہیں ہو جاتا اسی طرح امام حسینؑ کا نام بھی اور ان کی مصیبت بھی پرانی نہیں ہوتی، تمام سال، محرم اور صفر اسی طرح شب جمعہ میں امام حسینؑ کی مجالس برپا ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود اکتاہٹ نہیں ہوتی

جس طرح قرآن میں تحریف اور خیانت کرنا ممکن نہیں ہے، اسی طرح حسینی آثار میں بھی خیانت نہیں کی جاسکتی جیسے کہ کتنے اموی خیانت کاروں نے کتنے عباسی فرعونوں نے چاہا کہ نام حسینؑ اور ان کے آثار کو مٹا دیا جائے، قبر حسینی کو برباد کردیں ان کی مجالس کو بند کردیں لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔

خلیفہ عباسی ہارون الرشید کے حالات زندگی میں ملتا ہے کہ اس زمانے میں قبر حسینی پر کوئی بارگاہ نہیں تھی صرف قبر تھی اور اس کے ساتھ میں بیری کا درخت تھا کربلا کے زائرین اس درخت کی مدد سے مولیٰ کی قبر تک پہنچتے تھے جب ہارون الرشید کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے اس درخت کو کٹوا دیا اور اس وقت پیغمبرؐ کی اس حدیث (خدا لعنت کرے بیری کے درخت کو کٹوانے والے پر) کا مصداق بنا، لیکن وہ امام حسینؑ کے نور کو خاموش نہ کرسکا اور اس درخت سے بھی بہتر نشانی قبر حسینؑ کے حصے میں آئی۔

شیخ، امام حسینؑ کے بدن کے بارے میں بھی ایک جالب نقطہ عرض کرتے ہیں کہ قرآن کے بارے میں ارشاد ہے کہ ﴿لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ کہ جو حدث سے پاک نہیں وہ اس قرآن کو اور مس نہ کریں جب کہ امام حسینؑ کے ساتھ اس کے بالکل برعکس ہوا کہتے ہیں خبیث ہاتھ آپؑ کے سر مقدس تک پہنچے پھر فرماتے ہیں کہ قرآن کی آیات کے عدد (۶۶۶۶) ہیں جبکہ بناء بر مشہور وہ زخم جو کہ حضرتؑ کو لگے وہ (چار ہزار) ہیں اور اگر زخم کے اوپر لگے زخموں کو حساب کریں تو شاید وہ (۶۶۶۶) ہی ہو جائیں گے جو کہ قرآن کے اعداد کے برابر ہوں گے۔

درس (۴۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾

"نہیں مس کریں گے مگر یہ کہ پاک لوگ"

تزکیہ کے مراتب ہیں اور یہ پیغمبروں میں بھی موجود ہے

اس آیت کی مناسبت سے ہمیں چاہئے کہ کچھ بحث طہارت کے بارے میں کرلی جائے حضرت ختمی المرتبت محمدؐ سے مروی ہے کہ صفائی (پاکیزگی) نصف ایمان ہے طہارت کا مطلب پاک ہونا ہے، اور اس کا مطلب ہر چیز اور ہر کثیف چیز سے پاک ہونے کا نام ہے یہ ایک عام سا مطلب ہے اس لحاظ سے طہارت کے مراتب ہیں پس تمام چیزوں سے پاک ہونے کا مطلب ہے تمام قسم کی گندگیوں سے بچا جائے اس لحاظ سے جو جتنا بھی اس کا لحاظ رکھے گا وہ اتنا ہی پاک و پاکیزہ ہوگا۔

مقدس اسلام اور شریعت کا نتیجہ طہارت ہے اس لیے قرآن مجید میں خداوند

فرماتا ہے ﴿وَلٰكِنْ يُرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُم﴾ (۱)

کہ خدا چاہتا ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے اور نماز روزے اور زکواۃ اور واجبات کے ادا کرنے کے ذریعے سے معنوی کثافت کو دور کر دیا جائے سرس (۴۳)

جو شخص معنوی طور سے کثیف ہے اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور اگر کوئی شخص یہاں پر تزکیہ کرے تو وہ بہشت میں جائے گا۔ وہ امور جو کے پیغمبرؐ کے وضائف میں سے تھے ایک امر امت کا تزکیہ کرنا ہے، بلکہ یہ امر تعلیم پر بھی مقدم ہے جیسا کہ قرآن کی سورہ آل عمران آیۃ ۱۶۴ سے ظاہر ہوتا ہے (۲)

اسی طرح سورۂ والشمس میں پروردگار چودہ قسمیں کھانے کے بعد فرماتا ہے کہ جس شخص نے بھی اپنے نفس کی اصلاح کی وہ فلاح پا گیا (۳)

اب ہمیں چاہئے کہ طہارت کے معنی کو مزید سمجھیں تا کہ اس سے کچھ فائدہ بھی حاصل کر سکیں۔

غرور، تکبر اور ہوائے نفسانی باطنی نجاست ہیں

آپ سب ظاہری نجاسات کے بارے میں تو آگاہ ہیں اور یہ توضیح المسائل وغیرہ میں بیان ہو چکی ہیں،

لیکن اسی طرح باطنی نجاست اور بھی خطرناک ہیں جب بدن، لباس، وغیرہ کا تعلق خدا سے نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کے پاک رکھنے کی تاکید ہے تو پھر دل کا تعلق

(۱) سورہ مائدہ ۵ ۔ ۶ (۲) ﴿وَيُزَكِّيهِمْ ۔۔۔ الْحِكْمَةَ﴾ سورہ آل عمران آیۃ ۱۶۴ (۳) ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾ سورۃ والشمس ۹۱ آیۃ ۹

تو خدا کی ذات سے ہے اسے کتنا پاک رکھنا چاہئے۔(۱) اس بناء پر قلبی نجاست کو سب سے پہلے پاک کرنا چاہئے، باطنی نجاسات میں سے سب سے پہلی نجاست غرور، تکبر، اور ہوائے نفسانی کی ہے کیونکہ اگر ذرا سا بھی تکبر موجود ہو تو انسان پروردگار کی بارگاہ تک نہیں پہنچ سکتا، شیطان اسی وجہ سے خارج از درگاہ ہوا تھا (۲) اور جب اس نے خود کو بڑا سمجھا تو کتنا ذلیل اور چھوٹا ہو گیا۔

تقریبا اسی بات کو امیر المؤمنینؑ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں کہ خداوند متعال کسی بشر کو اس کے تکبر اور غرور کے ساتھ کس طرح سے جنت میں داخل کرے گا جب کہ اسی کی وجہ سے وہ (شیطان) کو اپنی بارگاہ سے دور کر چکا ہے (۳) ایک دوسرے پر فخر و مباحات کرنا جہالت کی وجہ سے ہے جیسے کہ میرا قلم، میرا مال، میری خوبصورتی، میرے بولنے کا انداز اور ان سب باتوں پر فخر کرنا خدا کی نعمت کو اپنا سمجھنا ہے اور اس پر فخر کرنا صحیح نہیں ہے اور خدا تکبر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا (۴)

اسی طرح ہوائے نفسانی بھی خدا پرستی کے خلاف ہے خداوند متعال قرآن مجید میں اس کی مذمت کرتا ہے جو کہ ہوائے نفسانی میں گھرا ہوا ہے (۱) اور یہ تینوں نجاسات باطنی ہیں جو کہ ظاہری نجاسات مثلاً کتے سور اور کافر کی طرح ہیں۔

(۱) انّ اللّٰہ یَنظُرُ ۔۔۔ الیٰ صُوَرِکُم (۲) فَمَا یَکُونُ ۔۔۔ لَمِنَ الصّٰاغِرِینَ سورہ اعراف ۷ آیت ۱۳ (۳) خطبہ قاصعہ نہج البلاغہ (۴) انّ اللّٰہ یُحِبُّ ۔۔۔ فَخُور سورۂ لقمان
(۱) رأیتَ ۔۔۔ ھَوَاہُ سورۂ فرقان ۲۵ آیت ۴۳

کینہ، حسد اور دشمنی دل کی بیماریاں ہیں

اَلْحِقْدُ وَالْحَسَدُ وَالْعَدَاوَةُ ۔ کینہ، حسد اور دشمنی مردار کے لاشے کی مانند ہیں اور جس دل میں بھی کسی مؤمن کے لئے کینہ بغض ہوگا وہ دل کو مردہ کردے گا اور اس دل سے روحانیت چلی جائے گی کیونکہ یہ سب کدورتیں اس کی غیبت، تہمت اور دوسری چیزوں پر ابھاریں گی اور ان میں سے کمترین چیز غیبت کرنا ہے جو کہ قرآن کی فرمائش کے مطابق لاش کھانے کی مانند ہے(۱)

انسان غیبت کیوں کرتا ہے اس لئے کہ حسد رکھتا ہے۔

شہوات پسندی نجاست کی طرف رغبت کرنا ہے

قلب کی تیسری بڑی نجاست شہوات نفسانی ہے جو کہ پیشاب اور پاخانے کی مانند ہے اس ضمن میں جو روایت رسول خداؐ سے نقل ہوئی ہے وہ بیان کرتی ہے کہ اس شخص کی قدر و منزلت کہ جس کی تمام ہمت ہی یہ ہو کہ کوئی چیز اس کے شکم میں جائے (چاہے جس طرح سے بھی ہو) تو اس کی منزلت بھی اس چیز کی مانند ہے جو کہ پیٹ سے باہر آتی ہے(۲) (مَنْ كَانَتْ هِمَّتُهُ مَا يَدْخُلُ فِي بَطْنِهِ كَانَتْ قِيْمَتُهُ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ) یعنی وہ شخص جو صرف کھانے پینے پر لگا ہوا ہے اور حرام وحلال کی تمیز نہیں کرتا ایسا شخص جو حرام یا حلال کی مراعات نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنے بدن کی صحت وتندرستی کا بھی خیال نہیں کرتا اس غذا کی مانند ہے جو ہضم ہو چکی ہو(یعنی

---

(۱) ولا یغتب--- فکرھتموہ سورۂ حجرات ۴۹ آیت ۱۲

(۲) لیالی الاخبار

مدفوع) بس وہ شخص جس کے دل میں شہوت دنیا ہے پیٹ کی لالچ ہے اور سب سے بڑھ کر حب دنیا ہے تو ایسا شخص روحانیت کی طرف راہ پیدا نہیں کرسکتا۔

غفلت عالم معنویت میں شراب کی طرح نجس ہے

اہم ترین نجاست جسے انحرافات کا سرچشمہ قرار دیا جاسکتا ہے وہ غفلت کرنا ہے اور وہ بھی غفلت یاد خداوندی سے اور یہ ایسی نجاست ہے کہ جسے شراب سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ شراب نجس ہے کیونکہ یہ عقل کو زائل کردیتی ہے اور مست آدمی اچھے و برے کی پہچان نہیں کرسکتا ہے اس لئے بُرے کام بھی انجام دے دیتا ہے اسی طرح غافل آدمی شیطان کا ساتھی ہے (اَلسُّكْرَانُ عَرُوسُ الشَّيْطَانِ) (۱) قرآن مجید میں غافل انسان کی سختی کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے اس شخص کی پیروی نہ کرو کہ جسے ہم نے اپنی یاد سے غافل کردیا ہے اور وہ ہوائے نفسانی کی اتباع اور پیروی کرتا ہے اس کا سب کام بے کار ہو کر رہ گیا ہے (۲) جس طرح سے ایک مست آدمی کو بہت سے خطرات لاحق ہوسکتے ہیں مثلاً زمین پر گرسکتا ہے اس کا سر دیوار سے ٹکرا سکتا ہے کنویں میں گرسکتا ہے یا اسے حیوان کاٹ سکتے ہیں یا اسی طرح اسے سکتہ ہوسکتا ہے اور اسی طرح بہت سی دوسری چیزیں جو کہ ایک مست آدمی پر لاحق ہوسکتی ہیں غافل آدمی کے لئے بھی بہت سے خطرات وگناہ لاحق ہوسکتے ہیں بلکہ ہر گناہ اسی غفلت کی وجہ سے ہے۔

---

(۱) لیالی الاخبار

(۲) سورۂ کہف ۱۸ آیۃ ۲۸

جو مؤمن آگاہ ہوتا ہے وہ گناہ نہیں کرتا

اصول کافی کی شرح میں فرماتے ہیں جب تک شخص مؤمن ہے کبھی زناء نہیں کرتا اسی طرح جب تک چور مؤمن ہے چوری نہیں کرتا (۱) علامہ مجلسیؒ اور دوسرے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر مؤمن حاضر الایمان ہوا تو اس سے محال ہے کہ کوئی گناہ سرزد ہو جو مؤمن آگاہ ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ خدا اس کے اعمال سے آگاہ ہے ملائکہ اس کے اعمال لکھ رہے ہیں واقعی مؤمن اللہ کی قدرت اور علم پر ایمان رکھتا ہے لیکن غافل شخص سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور یہ ایسے ہیں کہ ان کی کچھ بھی اہمیت اور ارزش نہیں ہے جیسا کہ قرآن میں اللہ فرماتا ہے یہ لوگ چوپائیوں کی طرح بلکہ اس سے بھی پست ہیں (۲)

---

(۱) اصول کافی (لایزنی الزانی وھو مؤمن ولا یسرق السارق وھو مؤمن)

(۲) سورۃ اعراف

درس (۴۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾

"نہیں مَس کریں گے مگر یہ کہ پاک لوگ"

گذشتہ رات ہم نے قلبی نجاست کے بارے میں گفتگو کی جو بہت ہی اہم گفتگو تھی اور کم ہی یہ مورد بحث واقع ہوتی ہے جب کہ آج ہم قلبی طہارتوں کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

باطنی نجاستوں کو زیادہ اہمیت دیں

جس طرح سے ظاہری نجاست کو پاک کرنے کے لئے مطہرات ہیں جیسے پانی، مٹی، آفتاب، اسلام، استحالہ، انتقال وغیرہ اسی طرح نجاست قلبی کیلئے بھی مطہرات ہیں اور ہر ایک ایمان دار کو چاہئے کہ اس سے استفادہ کرے۔

ظاہری نجاست کے بارے میں شرع مقدس میں بہت ہی آسانی ہے، اور
جب تک کہ نجاست کا علم نہ ہو جائے نجاست کا حکم نہیں آتا، جبکہ باطنی نجاست میں
جب تک اس کے برطرف ہو جانے کا یقین نہ ہو جائے آرام سے نہیں بیٹھنا چاہئے
جب کہ لوگ اس بات کے برعکس ظاہری نجاست کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور حد سے
زیادہ وسواسی ہو کر شیطان کی چال میں پھنس جاتے ہیں۔

انکساری تکبر کا علاج ہے

نجاست قلبی میں سے ایک نجاست تکبر کی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کو زائل
کرنے کے لئے سمندر کا پانی بھی کم ہے بلکہ اس کو پاک کرنے کے لئے ضروری ہے
کہ دوسروں کے ساتھ تواضع و انکساری سے کام لیا جائے، مثلاً جب کسی سے ملاقات
کرے اور دیکھے کہ وہ عمر میں زیادہ ہے تو یہ خیال کرے کہ وہ عمر میں زیادہ ہے تو اس کی
عبادت بھی مجھ سے زیادہ ہے لہٰذا اس کو اپنے سے زیادہ محترم شمار کرے اسی طرح جب
کسی چھوٹے بچے سے ملاقات کرے ہو تو یہ سمجھ کر کہ وہ مجھ سے عمر میں کم ہے تو اس کے
گناہ بھی کمتر ہیں اس لحاظ سے اس کا زیادہ احترام کرے۔

ہمیشہ اپنی اصل کو یاد رکھے کہ وہ خاک سے بنا ہے اور آخر میں خاک ہو جانا
ہے اور اس سے بھی نزدیک اس کی اصل نطفہ اور آخر میں مردار ہو جانا ہے جب
انسان کی حالت ایسی ہے تو اسے اس چار روزہ زندگی پر فخر نہیں کرنا چاہئے۔
بہر حال غرور و تکبر کا علاج فروتنی اور انکساری ہے مثلاً یہ کہ کسی محفل میں اپنی

شان سے نیچے بیٹھے، اگر اس کا احترام نہ کیا جائے تو اسے برا نہ لگے اگر اس کے لئے
کھڑے نہ ہوں تو یہ کہئے کہ میں کون ہوں جس کا احترام کیا جائے۔

رسولِ خداؐ کا تواضع کرنا سب کے لئے نمونہ ہے

اس میدان میں (بلکہ تمام میدانوں میں) ہمیں پیغمبر اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر
چلنا چاہئے جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ میں چند خصلتوں کو آخری عمر تک نہیں
چھوڑوں گا، خاک پر بیٹھنا، سلام میں پہل کرنا حتیٰ کہ چھوٹوں کو بھی پہلے سلام کرنا
، دوسروں کو برابر سمجھنا (یعنی جب آپ سوار ہوتے تو کسی کو پیدل نہ چلنے دیتے اپنے
لباس کو خود سیتے اپنے گھر کا کام خود کرتے آپ جھاڑو خود لگاتے آپؐ دودھ اپنے
ہاتھوں سے نکالتے (۱) اپنے پروردگار کے سامنے تذلل اور گریہ وزاری بہت مؤثر ہے
صحیفہ کاملہ میں حضرت سجادؑ اس لئے دستور فرماتے ہیں۔

یقین، عداوت اور کینہ کو کھا لیتا ہے

نجاست قلبی میں سے بغض، کینہ، حسد اور عداوت بھی ہیں جن کے مطہرات
بہت کم حاصل ہوتے ہیں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، کوئی چیز بھی یقین سے
زیادہ کامیاب نہیں ہے اور یقین بھی ایسا کہ تمام کام کو خدا کی طرف سے سمجھنا، اب اگر

---

(۱) بحار الانوار جلد

یہ یقین ہے تو پھر یہ غم، ودرد، سوز و گداز کیوں؟ جب تک کوئی شخص اس بات تک نہ پہنچ جائے کہ ہر چیز مقدر کی وجہ سے ہے تو وہ خسارے میں ہے، اگر خدا کسی کے لئے خیر کا ارادہ کرے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو منع کر سکے جب انسان کسی کو اپنے سے آگے دیکھتا ہے تو اس سے حسد کرنے لگتا ہے، اسے آگ لگ جاتی ہے اور وہ اس کی آگ میں جلنے لگتا ہے کیونکہ وہ سب کچھ (ظاہری) اسباب کو ہی سمجھتا ہے اس کے سد باب کے نتیجے میں حسد کرنے لگتا ہے۔

سبقت حاصل کرنا اور یہ جاننا کہ دنیا فانی ہے

ظلم اور بغاوت کے اسباب میں سے ایک زمین پر برتری حاصل کرنا ہے شاید بہت کم لوگ ایسے ہیں جن میں یہ خصلت نہ پائی جاتی ہو۔

جو شخص اس بات پر مائل ہے کہ اس کا لباس، اس کا فرش، اس کی دکان، یا اس کا مقام، اس کی شہرت سب سے زیادہ ہو تو ایسا شخص ظلم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا اور شاید اکثر اوقات ظلم و بغاوت اسی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

امام المتقین حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ اگر سات آسمانوں کی بادشاہت کے بدلے مجھ سے یہ کہا جائے کہ کسی چیونٹی کے منہ سے جو کے چھلکے کو چھین لوں تو میں ایسی پیشکش کو کبھی بھی قبول نہ کروں (۱)

جنت ان لوگوں کیلئے ہے جو برتری نہ چاہتے ہوں

آیۂ شریفہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے جنت کو ان لوگوں کے لئے قرار دیا ہے جو زمین میں برتری نہیں چاہتے، اور فساد برپا نہیں کرتے اور عاقبت متقین کے لئے ہے (۲)

کتاب معالم الغیب میں حاجی نوریؒ دو تین صفحوں میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اہم نکتہ (لا یُرِیدُونَ) کی تعبیر استعمال ہوئی ہے یعنی ایسے افراد جو کہ علو اور برتری کا ارادہ بھی نہ کرتے ہوں (ان کے لئے جنت ہے) کیونکہ اعمال ارادے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی دل میں برتری اور بڑائی کا خیال بھی نہیں آنا چاہئے۔ اس بڑائی کی نجاست کو دور کرنے کے لئے یہ جاننا اور مان لینا ہے کہ دنیا فانی ہے اس کا مظہر ہے اور فانی دنیا کا علم حاصل کرنا اس کی نجاست سے دوری اختیار کرنے کے سبب ہے البتہ یہ علم یقین حاصل کرنے کی نسبت آسان ہے اور یہ ریاضت اور مشقت کرنے سے حاصل ہوتا ہے انسان کو چاہئے کہ وہ گذشتہ واقعات سے عبرت پکڑے اور سوچے کہ فرعون، جمشید، پہلوی سب کہاں گئے اور ان کی مملکت کو کیا ہو گیا برتری طلب کرنے والے (ہٹلر) کہاں گئے ان کی جمع کی ہوئی دولت کہاں گئی۔

---

(۱) نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۴

(۲) ﴿تِلْکَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا ... وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ سورۂ قصص ۲۸ آیت ۸۳

روزہ شہوت کی آگ کو ختم کرتا ہے

نجاست قلبی میں ایک نجاست شہوت پرستی ہے اور ان کی تمام اقسام سورۂ شریفہ آل عمران میں آچکی ہیں جو کہ انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں اس کا علاج روزہ رکھنا ہے اور یہ شہوت کو کم کرنے میں کافی مؤثر ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ زیادہ کھانا نہ کھائے بلکہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ روزہ اس وقت مفید ہے کہ جب انسان کی خوراک نصف حد تک کم ہو اسی وجہ سے آپ دیکھیں کہ روزے میں عصر کے وقت شہوت کس حد تک ختم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ بولنے کی شہوت حتّٰی کہ کھانے کی شہوت بھی کم ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کی یہ آواز یونہی ہے اور انسان کو اس کا اسیر نہیں ہونا چاہئے بھوک کو سفید موت کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دل کو سفید کر دیتی ہے، خصوصاً غیر شادی شدہ جوانوں کو روزہ رکھ کر عفت حاصل کرنا چاہئے۔(۱)

ذکر خدا غفلت کا علاج ہے

نجاست قلبی میں ایک غفلت کرنا ہے اور اس کا علاج یاد خدا میں پنہاں ہے ہر جگہ، کوچہ و بازار میں گھر میں گلیوں میں دل یاد خدا سے آباد رہے اور اگر کسی شخص کی نماز قبول ہو جائے تو اس کے لئے معراج ہے (الصلواۃ معراج المومن)

---

(۱) ﴿و لیستعفف الذین لا یجدون نکاحا﴾

خدا کی یاد کی طرف توجہ نہیں ہے یہ ذکر نہیں ہے کیونکہ ذکر میں توجہ کی شرط ہے۔

قطعی طور سے ذکر کے مصادیق میں ایک نماز ہے ﴿فاسعوا الی ذکر اللہ﴾ کیا انسان باطنی نجاست کے ساتھ معراج پر جا سکتا ہے؟ نہیں اس لئے انسان کو چاہئے کہ انسان پرہیز گاری اختیار کرے اور پرہیز گاری حاصل کرنے کا ایک آلہ نماز ہے۔

علماء اخلاق میں سے ایک نے باطنی نجاست کے علاج کو بہت خوبصورت اشعار میں بیان کیا ہے۔

موانع تا نگردانی زخود دور
درون خانہ دل نایدت نو

موانع چون در این عالم چہار است
طہارت کردن از آنھم چہار است

نخستین، پاکی از احداث وانجاس
دوم، از معصیت واز شر وسواس

سیم پاکی ز اخلاق ذمیمہ
کہ باوی ہست آدم چون بھیمہ

چہارم پاکی سراست از غیر

کہ اینجا منتہی می گردوت سیر

ھرآن کو کرد حاصل این طہارت

شود بی شک سزاوار مناجات

چو ذاتت گشت پاک از این ھمہ شین

نماز گردد آنگہ قرۃ العین

ترجمہ اشعار:

(۱) جب تک باطنی روکاوٹیں اپنے سے دور نہ کی جائیں گی تب تک دل کے اندر کی صفائی ممکن نہیں

(۲) دنیا میں باطنی روکاوٹیں چار طرح کی ہیں ان چاروں سے ہی قلب و روح کی طہارت ممکن ہے

(۳) پہلی یہ کہ ظاہری و باطنی نجاستوں کو دور کرے دوسری نافرمانی خدا اور وسوسوں سے خود محفوظ رہے

(۴) تیسری روکاوٹ یہ کہ بداخلاقی سے خود کو دور کرے ورنہ انسان اور حیوان میں تمیز جاتی رہے گی

(۵) چوتھی یہ کہ غیر خدا پر اپنے دلی راز کو ظاہر نہ کرے جاننا چاہیے کہ انسانی سیرت ان ہی چار پر منحصر ہے

(۶) جو کوئی اسطرح کی طہارت سرانجام دے یقیناً اس کا ہر قول و عمل مقبول بارگاہ خداوندی ہوگا

(۷) جب نفس ان عیبوں سے پاک ہوجاتا ہے تب نماز بھی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار پاتی ہے

جیسا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

﴿الصّلوٰۃُ قُرَّۃُ عَیۡنِی﴾ ''نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے''

درس (۴۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَفَبِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾

''نہیں مَس کرینگے مگر یہ کہ پاک لوگ کے، سارے جہاں کے پروردگار کی طرف سے (محمدؐ) پر نازل ہوا ہے تو کیا تم لوگ اس کلام سے انکار کرتے ہو اور تم نے اپنی روزی یہ قرار دے لی ہے کہ اسکو جھٹلاتے ہو''

پاک لوگوں کے سوا کوئی بھی قرآن کے معنٰی سے استفادہ نہیں کرسکتا

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ قرآن اللہ و تبارک و تعالٰی کا کلام ہے اور اللہ کی ذات پاک اور منزہ ہے اور تمام پاکیزگی اس کی ذات سے وابستہ ہے اور اللہ کے اسماء

میں سے ایک اسم مطہر بھی ہے، خدا پاک ہے اور خدا کا کلام بھی پاک ہے جو کہ ختمی المرتبت محمد مصطفٰےؐ کے قلب پاک پر نازل ہوا اور اس کا رابطہ بھی جبرائیل پاک تھے اس بناء پر قرآن سے استفادہ وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو کہ پاک ہوں لہٰذا وہ افرا جو کہ کثافت میں آلودہ ہوں، حب دنیا رکھتے ہوں قرآن سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

﴿لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ جس کا دل اور آنکھیں روشن ہوں کیونکہ اس سے بیشتر بہرہ مند ہو سکیں گے (پس) اس کو مس نہیں کر سکتے سوائے ان لوگوں کے جو دنیا کی محبت سے آرزو اور مال سے پاک ہو گئے ہیں کیونکہ یہ وہ حجاب ہیں جو کہ آنکھ اور دل پر پردہ ڈال دیتے ہیں اس وجہ سے قرآن کریم نے فناء دنیا اور اس کی بے اعتباری کو مختلف تعبیرات سے بیان کیا ہے۔

دنیا بازیچہ سے زیادہ نہیں (۱) اے بوڑھے لوگو تمہاری عمریں کہاں گئیں، تو تم کہو گے کہ جیسے خواب، یا قرآن کی تعبیر کے مطابق اس بارش کے مانند جو برس جائے، زمین سرسبز ہو جائے نباتات اگنے لگیں پھر ایک دفعہ میں خزان آجائے اور ان برگ و بار کو خشک کر دے ایسے کہ کوئی چیز ہی باقی نہ بچے (۲) یہ تمام مطالب ان کے لئے ہیں جو شہوات میں غرق ہیں کیونکہ ان کے باطنی ادراکات پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا دنیا کے فناء ہونے میں شک و شبہ ہے۔

---

(۱) العلمو ـــ لعب و لهو﴾ (۲) ﴿انما مثل الحياة الدنيا ـــ كان الله على كل شئ مقتدرا

لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس کو مانتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹے گناہ' آنکھوں کے سامنے حجاب بن جاتے ہیں اور انسان معارف کو حاصل نہیں کر سکتا' چنانچہ جو بھی آنسو کا قطرہ پشیمانی کے ساتھ گرتا ہے اس پردے کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتا ہے اور عبادت کے اخلاص کو نورانی کر دیتا ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

عروس حضرت قرآن نقاب آنگہ براندازو
کہ دار الملک ایمان را مجرد بیند از غوغا
عجب نبود گر از قرآن نصیبت نیست جز نقشی
کہ از خورشید جز گرمی نبیند چشم نابینا

(۱) قرآن دُلہن کی طرح اپنے چہرے سے نقاب اس وقت ہٹاتا ہے جب مومن دنیاوی آلائشوں سے اپنے ظاہر و باطن کو پاک کر چکا ہو۔

(۲) اس میں تعجب نہیں کہ چشم نابینا قرآن کو حروف ونقوش ہی سمجھے گا جیسے کہ اندھا انسان سورج کی تپش کے سوا دیگر فوائد کا درک نہیں کر سکتا ﴿تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ لہٰذا یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

قرآن عظیم ہے جیسے کہ خود اللہ عظیم ہے

قرآن کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے

اور اس کی عظمت اس کے متکلم کی وجہ سے ہے (الکلام صفة المتکلم) خدا کا کلام ہونا قرآن کی صفات میں سے ہے اور جو عظمت متکلم کی ہوتی ہے وہ عظمت کلام میں بھی نظر آتی ہے۔

﴿تَنْزِيلٌ﴾: مصدر ہے لیکن منزل (مفعول) کے معنی میں آیا ہے۔

قرآن ﴿رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کی طرف سے ہے اور جو بھی اسے مناسب طور سے پڑھے گا یہ اپنا اثر اس پر دکھائے گا، البتہ پتھر سے بھی زیادہ سخت دل اور ظلمات کی تاریکی سے زیادہ تاریک دل اس سے ختم ہو چکے ہیں اور راہ راست پر آ چکے ہیں۔

انسان اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ وہ پاک ہے لیکن جب وہ حساب و کتاب لگاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ غلطی پر ہے کیونکہ اس کے سامنے سے جب پردے ہٹ جاتے ہیں تو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ان لوگوں کے لئے ایسی چیزیں آشکار ہو جائیں گی جس کا انہوں نے گمان تک نہ کیا ہوگا (۱) آپ نے سنا ہوگا کہ جب رسول خدا قرآن پڑھتے تو مشرکین اپنے کانوں کو بند کر لیتے تا کہ سن نہ سکیں۔

ایک بات یہاں پر ناگفتہ نہ رہ جائے کہ عظیم ہی عظمت کو درک کر سکتا ہے اور ہر خُرد و کند ذہن اور چھوٹا عظمت قرآن کو درک نہیں کر سکتا جب تک کہ خود عظیم نہ ہو جائے۔ مؤمنین کی عادت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قرآن کا خوب احترام کرتے

---

(۱) ﴿و بدا لهم من الله ما لم يكونو يحتسبون﴾

ہیں قرآن کو چومتے ہیں اس کو سر پر رکھتے ہیں اس کو عظمت والی اور اچھی جگہوں پر رکھتے ہیں، کہ کہیں خدانخواستہ قرآن کی طرف پاؤں نہ دراز ہو جائے اور کہیں کوئی اور چیز اس پر نہ رکھ دی جائے۔

مشرکین قرآن کو سبک جانتے تھے: بعد والی ایک آیت میں خدا مشرکین کی مذمت کرتا ہے کہ ﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُدْهِنُوْنَ﴾

آیت میں حدیث سے مراد خود قرآن مجید ہے اور حدیث کہنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس میں واقعات بھی ذکر ہوئے ہیں ﴿مُدْهِنُوْنَ﴾ مداھنہ سے مشتق نکلا ہے جس کے معنی سہل انگاری یا بے اعتنائی کرنے اور لاپرواہی کے ہیں جو مومن ہے وہ قرآن کو عظیم سمجھے گا کیونکہ یہ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا بھیجا ہوا (کلام ہے) جب کہ کفار و مشرکین قرآن کو سرسری اور بے اعتناء سمجھتے تھے۔

﴿اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُدْهِنُوْنَ﴾ کہ اس قرآن کے ساتھ جو کہ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کی طرف سے آیا ہے بے اعتنائی برتتے ہو۔

کافر قرآن کے تکذیب کا رزق لیتے ہیں

﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ ''کہ اے کافرو! تم نے اپنے نصیب کو اور روزی کو یہ قرار دیا ہے کہ قرآن کی تکذیب کرو اور اسے جھٹلاؤ۔''

ظاہری آیت سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں مشرکین کی مذمت اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ وہ قرآن سے علم میں اضافہ کرنے کے بجائے اس سے بہرہ مند

ہو کر اس سے فائدہ اٹھائیں اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

دوسری وجہ جو کہ روایات میں بھی بیان ہوئی ہے کہ جو مطلق رزق کو بیان کرتی ہے یعنی روزی چاہے جسمانی ہو یا مادی نورانی ہو یا روحانی، اسی طرح قرآن بھی رزق ہے اور یہ عقل کے لئے رزق ہے اس روایت کے مطابق شکر تقدیر میں ہے، یعنی ﴿وَتَجْعَلُوْنَ شُكْرَ رِزْقِكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ یعنی اے مشرکوں تم اس قرآن پر شکر ادا کرنے کے بجائے تم نے اپنی روزی یہ بنالی ہے کہ اس کی تکذیب کرو اور اسے جھٹلاؤ؟

بارش کی نسبت افلاک کی طرف دینا خدا کو جھٹلانا ہے

روایات اہل بیت علیہم السلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت زمانہ جاہلیت کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے ہم تشریح کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ تین چیزیں زمانہ جاہلیت کے عمل میں سے ہے یعنی اس زمانے سے کہ جب پیغمبر اکرمؐ مبعوث نہ ہوئے تھے۔

اوّل:۔ حسب کے اعتبار سے طعنہ دینا یعنی کسی کے پیشے کے لحاظ سے اس کی اولاد کو برا کہنا مثلاً کسی ایسے شخص کو کہ جس کا باپ وزن اٹھاتا تھا یا موچی تھا تو اس کی اولاد کو یہ کہنا کہ یہ موچی کی اولاد کیا کر سکتا ہے۔

دوئم:۔ اپنے نسب پر فخر کرنا، مثلاً میرا باپ فلاں تھا اس کے پاس اتنی دولت و سلطنت تھی یہ سب کے سب امور زمانہ جاہلیت میں پائے جاتے تھے جیسے کہ ایک

مشرک حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور پانچ پشت تک اپنے اجداد کا نام لیکر یہ سمجھنے لگا کہ ایسا کرنے سے وہ پیغمبر کی نظر میں محترم ہو جائے گا پیغمبرؐ نے فرمایا (ان پانچوں کا جن کا تو نے نام لے لیا ہے) اور تو چھٹا یہ سب کے سب جہنمی ہیں وہ لوگ جو کہ مشرک تھے اور جو جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں ان کا نام لیکر افتخار کر رہا ہے، مرنے کے بعد سب یکساں ہیں بادشاہ ہو کہ فقیر، امیر ہوں کہ غریب سب خاک میں مل جائیں گے۔

سوئم:۔ وہ چیز جو زمانے جاہلیت میں رائج تھی کہ جو ہماری بحث کا مورد بھی ہے (بارش کی نسبت بادل اور آسمان کی طرف دینا ہے)

جاہلیت کے زمانے میں ہوا اور بارش کے آنے کو اسی ستارے سے منسوب کیا جاتا تھا جب بارش ہوتی تو کہتے (امطرنا بالثریا۔ امطرنا بالسماک) ہم نے بارش بھیجی ثریا کے واسطے یا آسمان کے واسطے سے۔ اور یہ سب کفر اور زندقہ ہیں جو بارش کو افلاک اور ستاروں کی وجہ سے سمجھتے ہیں اور ان وسیلے کو مستقل سمجھتے ہیں۔

تفسیر منہج الصادقین میں رقم ہے کہ لشکر اسلام کسی غزوہ میں پانی کی کمیابی اور قلت سے دوچار ہو گئے سب نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں تا کہ رحمت باران کا نزول ہو، پیغمبرؐ نے فرمایا کہ ڈرتا ہوں کہیں تم بارش کے آنے کو ستاروں سے نسبت نہ دو، لوگوں نے کہا کہ پیغمبر گرامیؐ ابھی تو اس ستارے کے طلوع ہونے کا موقع ہی نہیں پھر کس طرح سے اس کی طرف نسبت دے سکتے ہیں۔

جیسا کہ شیخ صدوقؒ فرماتے ہیں کہ منجمین کے اقوال میں تحقیق کرنے سے

پتہ چلتا ہے کہ ۲۸ ستارے ہیں کہ ان میں سے ایک ۱۳ راتوں غروب ہو جاتا ہے اور طلوع فجر کے وقت دوسرا ستارہ اس کے روبرو طلوع ہو جاتا ہے اسی طرح تمام سال یہ ہوتا رہتا ہے(۱)

پیغمبر اکرمؐ کسی گوشے میں کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز بجالائے اور اپنے ہاتھوں کو دعا کے لئے بلند کیا اور بارش کے لئے دعا کی فوراً بادل آئے اور برسنے لگے لشکریوں نے اپنی اپنی مشکوں اور برتنوں کو بھر لیا حضور اکرمؐ گوشہ و کنار میں ٹہل رہے تھے کہ اس اثناء میں آپ نے سنا کہ لشکریوں میں کوئی کہہ رہا ہے کہ ہمیں یہ پانی فلاں ستارے کی برکت سے نصیب ہوا ہے، اس وقت حضرتؐ نے ارشاد فرمایا:

کہ میں جانتا تھا کہ تمہارے درمیان ایسے ہیں جو یہ بات کہیں گے۔

روایات میں ایسے اشخاص کے بارے میں جو افلاک کو یا ستاروں کو مستقل طور پر مؤثر مانتے ہیں کفر کا حکم آیا ہے اور بہت سے علماء کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ جو ستاروں کو بارش یا تاثیر میں مستقل مانے وہ کافر ہے، لیکن ان کی حرکات کو اور طلوع و غروب کو شاہد کے طور پر اخذ کرنا یا ان کے میزان کو چاند گرہن یا سورج گرہن کے طور پر حساب و کتاب کرنا صحیح ہے اور اس کی ممانعت نہیں ہے۔

ستاروں کا ٹوٹنا کسی کی پیدائش یا موت سے مربوط نہیں

بحار الانوار میں ہے کہ ایک روز رسول خداؐ نماز عشاء کے بعد مسجد میں بیٹھے

(۱) مستدرک، سفینۃ البحار ص ۲۱۹

تھے کہ ایک نور پیدا ہوا اور ستارہ نازل ہوا پیغمبرؐ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی ستارہ ٹوٹتا تو کیا کہتے تھے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ کہتے تھے کہ کوئی بزرگ پیدا ہوگا یا کوئی بزرگ مرجائے گا آپؐ نے فرمایا کہ ہر دو بات غلط ہے یعنی ستارے کے ٹوٹنے اور کسی کے مرنے یا پیدا ہونے میں کوئی ربط نہیں ہے۔

مرحوم سیدؒ نے وسیلہ میں تنجیم کی حرمت کو مشروط کیا ہے کہ جب کوئی ان کے مستقل اثر انداز ہونے کو کہے جس طرح کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

درس (۴۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾

''اور تم نے اپنی روزی یہ قرار دے لی ہے کہ (اسکو) جھٹلاتے ہو''

نعمت عطا کرنے والے کا شکر عقلاً واجب ہے

ہر انسان کی عقل کہتی ہے کہ نعمت عطا کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جائے اگر کوئی تم پر احسان کرے تو تمہیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، یہ عقل کا حکم اور فطرت کا فیصلہ ہے اس لحاظ سے پہلے ہم (نعمت عطا کرنے والے) کو پہچاننا چاہیے تا کہ اس کا شکر ادا کیا جا سکے خصوصاً جب ایسا نہ کرنے سے خطرات بھی لاحق ہوں، جیسے کہ اگر شکر ادا نہ کیا جائے تو یہ کفران نعمت ہوگا اور اگر کوئی کفران نعمت کرے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس سے نعمت چھین لی جائے اور اس کو عذاب دیا جائے، تو اس صورت میں عقل

حکم کرتی ہے کہ پہلے منعم کو پہچانا جائے تا کہ اس کی سپاس گذاری اور شکر ادا کیا جا سکے اور نقصان سے بچا جا سکے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے ﴿لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید﴾ کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا اور اگر کفران نعمت کیا تو بے شک میرا عذاب سخت ہے

حضرت امام جعفر صادقؑ کی روایت کے مطابق آپؑ قبر کے فشار کی جو وجوہات میں سے ایک وجہ نعمت کو ضائع کرنے کو سمجھتے ہیں (۱)

اس لحاظ سے ہم یہ استفادہ کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شاکر ہو اور شکر ادا کرے تو اس کے لئے فشار قبر کا عذاب نہ ہوگا۔

رزق کیا ہے اور اس کا شکر کون سا ہے؟

شیخ بہائیؒ رزق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جو بھی زندگی کے لئے ضروری ہے وہ سب رزق ہے چاہے وہ خوراک ہو چاہے وہ لباس اسی طرح گھر یا اس کے لوازمات سب رزق ہیں اور رزق صرف خوراک میں منحصر نہیں ہے بدن کی قوتیں، آنکھ، کان، ہاتھ پاؤں بلکہ تمام رگیں اور ہڈیاں یہ سب کی سب رزق خداوندی ہیں، گھر جو کہ مٹی پتھر سے تعمیر کیا جاتا ہے تاکہ ہمیں سردی و گرمی سے بچا سکے یہ بھی رزق ہے۔

---

(۱) قال رسول اللہ۔ سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۱۰۴

اب دیکھنا یہ ہے کہ شکر کس چیز کے لئے ہے علامہ مجلسیؒ نے امام جعفر صادقؑ سے روایت نقل کی ہے امامؑ فرماتے ہیں کہ جو بھی تم سانس لیتے ہو اس کے لئے شکر واجب ہے بلکہ ہزار شکر یا اس سے بھی زیادہ (۱) کیونکہ ہر چیز انسانی بدن کے چند حصوں سے مربوط ہوتی ہے، منہ یا ناک سے ہوا پھیپھڑے میں داخل ہوتی ہے جس سے تمام بدن کے اعضاء کو صاف شدہ خون میسر آتا ہے اس بارے میں سعدی کی عبارت بہت عمدہ ہے جسے انہوں نے گلستان کے شروع میں بیان کیا ہے ہر سانس کے لئے جو اندر جاتی ہے نعمت اور حیات کا سبب ہے اور جب باہر نکلتی ہے تو فرحت بخش ہے (اگر سانس نیچے نہ جائے تو شخص ہلاک ہو جائے گا اور اگر باہر نہ نکلے تب بھی مر جائے گا پس ہر سانس کے لئے دو نعمت موجود ہے ایک اندر جانا اور دوسرا باہر نکلنا اس لحاظ سے ہر نعمت کا بھی شکر لازم ہے۔

روزی کا دینے والا صرف خدا ہے

اس وقت حضرتؑ فرماتے ہیں کہ کس طرح سے شکر ادا کیا جائے اور کمترین درجہ شکر کرنے کا یہ ہے کہ روزی کا سبب خدا کی ذات سمجھے نہ کہ دوسروں کو اور دل صرف خدا کی طرف ہو اور یہی قلب کی عبادت ہے (۲)

مثلاً جب کوئی مریض ہو تو طبیب کی طرف جائے اور دوا لے اور شفاء پانے کے بعد کہے کیا طبیب تھا، کیسی عمدہ دوا تھی یہ سب باتیں خدا کے شافی ہونے کے

---

(۱) سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۷۱۰ (۲) سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۱۰

بارے میں کفران کرنا ہے بلکہ انسان کو کہنا چاہئے، خدا کتنا مہربان ہے کہ جس نے فلاں دوا یا فلاں طبیب کے ذریعے سے شفاء دلوائی کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہی دوا اثر نہیں کرتی اور یہی طبیب فائدہ نہیں دلا سکتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور دانتوں کے درد کی دوا

کتاب لوامع البینات میں ہے کہ ایک دفعہ موسیٰ بن عمران دانتوں کے درد میں مبتلاء ہو گئے تو پروردگار سے شکایت کی تو پروردگار نے فرمایا کہ فلاں جڑی بوٹی کو استعمال کرو، موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور ٹھیک ہو گئے دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا انہوں نے جڑی بوٹی کو استعمال کیا وہ تندرست نہ ہوئے تو پروردگار سے ارشاد فرمایا کہ اے پروردگار کیا ہوا کہ جب میں نے پہلی دفعہ کھایا تو اثر ہوا لیکن اب جب کھایا تو اثر نہ ہوا آواز آئی کہ موسیٰ پہلی مرتبہ تم نے مجھ سے امید لگائی جب کہ دوسری مرتبہ تم نے دوا اور جڑی بوٹی سے امید رکھی اور ہماری یاد سے غافل رہے، البتہ واسطے کا بھی شکر ادا کرنا چاہئے ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹروں کا شکر ادا نہ کیا جائے لیکن اسے مستقل فرض نہ کرے اور کافر نہ ہو جائے بلکہ شفاء کا اصلی سبب خدا کو مانے۔

رزق پر خوشی کا اظہار کرنا بھی شکر ہے

(والرضا بما اعطیٰ) پھر فرمایا کہ شکر کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ عطا کی گئی نعمت پر

راضی اور خوش رہا جائے اور ایسا نہ ہو کہ جو نعمت اسے دی گئی ہو اس کو نظر انداز کر دے ایسا کرنا کفران نعمت ہے، اگر خدا نے کسی کو چھوٹا گھر دیا ہے تو کسی ایسے شخص کو نہ دیکھے جس کے پاس پارک بھی ہے بلکہ ایسے لوگوں کی طرف نظر کرے جو کرائے پر رہتے ہیں اس جملے کی شرح کرنے کے لئے بہترین چیز وہ حدیث ہے جس کو واقعہ کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت داؤدؑ کا دوست ایک شکر گزار بندہ ہے

بحار الانوار میں ہے جب حضرت داؤدؑ نے خدا سے دعا کی کہ اے پروردگار مجھے میرے اس ہمنشین اور ساتھی کے بارے میں بتا جو کہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا، تو حضرت داؤدؑ کو بتایا گیا کہ جب تم کل شہر کے باہر سب سے پہلے جس سے ملاقات کرو گے وہ تمہارا ہمنشین ہوگا، حضرت داؤدؑ اپنے بیٹے حضرت سلیمان کے ساتھ گئے تو سب سے پہلے جس سے ملاقات کی وہ جناب متی حضرت یونسؑ کے والد تھے، جب وہ پہاڑ سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرنے کی غرض سے آرہے تھے، اور اسی اثناء میں انہوں نے آواز لگائی کہ کون ہے جو یہ لکڑیاں خریدے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے وہ لکڑیاں جناب متی سے خرید لیں یہی وہ موقع تھا جب حضرت داؤدؑ کی ان سے ملاقات ہوئی۔ حضرت داؤدؑ نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا کہ کیا ممکن ہے آپ ہمیں اپنا مہمان بنا لیں؟ انہوں نے کہا جی ہاں اور اسی پیسے سے جسے پروردگار نے عطا کیا تھا گندم خرید کر لائے اس سے آٹا بنایا تین روٹیاں تیار کیں اور ہر لقمہ کی

ابتداء سے پہلے ﴿بسم اللہ اور الحمد اللہ﴾ کہتے رہے اور آخر میں ہاتھوں کو بلند کر کے کہنے لگے پروردگار میں نے جو لکڑیاں بیچی ہیں اس کے درخت کو تو نے اگایا اسے تو نے خشک کیا، اور وہ طاقت جس سے کہ میں لکڑیاں کاٹ سکوں تو نے عطا کی ہے اور اس لکڑی کا خریدار تو نے مہیا کیا اور اس گندم کو کہ جسے ہم نے کھایا اس کا بیج تو نے پیدا کیا اس کے وسائل آٹا، روٹی بھی تیری عطاء ہے اور ان نعمتوں کے مقابلے میں میں نے کیا کیا ہے یہ کہنے کے بعد ان کے اشک جاری ہو گئے۔

حضرت داوٴدؑ نے حضرت سلیمان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا کہ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص پیغمبروں کے ساتھ محشور ہوگا اور اس شخص کی ایسی معرفت ہے کہ ہر نعمت کو خدا کی عطا سمجھتا ہے اور اس پر قانع وشاکر ہے، کیا یہ ایک روٹی کم ہے اور اس کی ارزش (value) کم ہے اگر خدانخواستہ قحط پڑ جائے تو اس کی قدر و منزلت معلوم ہو جائے گی دوسری بات یہ کہ جو بھی چیز اس کے پاس ہے اس پر راضی وخوشنود ہے اور اپنے آپ کو اس کے شکر ادا کرنے میں قاصر سمجھتا ہے۔

درس (۴۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم عمومی نعمتوں کی طرف متوجہ نہیں ہیں

جیسا ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے کہ نعمت کے شکر ادا کرنے کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان تمام نعمتوں کو خدا کی طرف سے سمجھے البتہ یہ کہہ دینا آسان ہے لیکن ایسے لوگ بہت ہی کامیاب ہیں جو اس مرحلہ تک پہنچتے ہیں۔

اکثر اوقات لوگ یا تو نعمت ہی کو نہیں سمجھتے یا اگر نعمت سمجھیں بھی تو اس کو غیر خدا سے سمجھتے ہیں ﴿و قلیل من عبادی الشکور﴾ میرے بندوں میں شکر ادا کرنے والے قلیل (کم) ہیں نعمتوں میں سے کچھ ایسی نعمتیں ہیں جو عمومی ہیں اور ہر شخص کو عطا کی گئی ہیں چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا، بڑا ہو یا چھوٹا ان نعمتوں سے ہر ایک مستفید ہوتا ہے جیسے کہ پانی اور ہوا کی نعمت کیونکہ یہ بہت ہی فراوان ہیں اس لئے اسے نعمت نہیں سمجھتے جب کہ ان پیسوں کو جو کہ ہمارے ہاتھ آ جائیں نعمت سمجھتے ہیں۔

واقعی جب کسی ایسی جگہ جائیں جہاں ہوا کی کمی ہو اور سانس لینا بھی دشوار ہو یا کسی ایسے سفر میں جہاں پانی کی قلت ہو تو وہاں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتنی بڑی نعمتیں تھیں جو ہمیں میسر تھیں اس وقت سمجھ میں آجائے گا اور اس وقت امام زین العابدینؑ کے ہمنوا کہیں گے کہ ہم وہ پیاسے ہیں جسے تو نے سیراب کیا اور ہم وہ بھوکے ہیں کہ جسے تو نے پیٹ بھر کے کھانا عطا کیا(۱)

دوسری بات کہ اگر وہ نعمت کو سمجھے بھی تو اس کا تعلق وسائل سے سمجھتا ہے مثلاً پیاس کے بجھنے کو پانی سے اور بھوک کے مٹنے کو غذا سے سردیوں سے بچنے کو لباس سے سمجھتا ہے غرض یہ لوگ شکر ادا نہیں کرتے (۲)

اسباب کو دیکھتے ہیں لیکن مسبب الاسباب کی طرف نظر نہیں کرتے انھیں چاہئے کہ جان لیں بھوک کو ختم کرنے والی خدا کی ذات ہے ورنہ جسے بیماری ہو (بھوک لگنے کی) وہ جتنا بھی کھائے بھوک ختم نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کسی کے ارادے سے بھوک ختم ہوتی ہے نہ پیاس بجھتی ہے۔

نعمتوں کا شمار کرنا اس کا شکر ہے

نعمت کے شکر کا دوسرا رکن اس نعمت پر خوش ہونا ہے (والرضا بما اعطی) اور دل خوش ہو اس نعمت پر جو اسے عطا کی گئی ہے اور اس کی وجہ سے اس میں خوشی پیدا ہوگی اس طرح کہ وہ سمجھے کہ خاکی بندے کو کن کن نعمتوں سے نوازا گیا اسی وجہ سے نعمتوں کا گننا بھی نعمت کے شکر میں آتا ہے قرآن مجید میں بھی نعمت کے گننے کا

(۱) والظمآن الذی ..... دعا ابی حمزہ ثمالی (۲) سورۃ ۶ ایۃ ۶۱

امر (حکم) ہوا ہے(۱)

صرف نعمت پر خوش ہو جانا فائدہ مند نہیں

نعمت پر خوش ہونا تین قسموں پر مشتمل ہے پہلی قسم صرف خوش ہونا: مثلاً اپنی اولاد کو دیکھ کر خوش ہونا اور فرحت محسوس کرنا اس کی وجہ سے میرا نام زندہ رہے گا اور بڑھاپے کا سہارا بنے گا یہ بھی محض خواہش نفسانی ہے اور اس کی بھی کوئی ارزش نہیں ہے کیونکہ یہ نعمت کو تو دیکھتا ہے لیکن معطی نعمت (نعمت دینے والے) کو فراموش کرتا ہے یہ بھی ایک قسم کا کفرانِ نعمت ہے اسی طرح اگر کوئی شخص گھر کی نعمت پر خوش ہے کہ واقعی کتنا اچھا ہے کہ کرایہ دینا نہیں پڑتا یہ بھی نعمت سے سرشار ہو جانا اور منعم سے منہ موڑنا ہے اسی وجہ سے قرآن ایسے عبادت گزار بندوں کو جو کہ شکر ادا کرتے ہیں کم پاتا ہے۔

دوسری قسم کی خوشحالی: اس طرح سے کہ واقعی یہ نعمتیں خدا نے اسے دی ہیں اور خدا کا احسان ہے یہ خوشی اگرچہ شکر ہے لیکن یہ بھی ناقص ہے تیسری قسم اس طرح کہ وہ صرف نعمت پر خوش نہیں ہوتا بلکہ اس کے بھیجنے والے پر خوش ہوتا اس طرح کہ وہ صرف نعمت پر خوش نہیں ہوتا بلکہ اس کے بھیجنے والے پر خوش ہوتا ہے وہ اس پر اس لئے خوش ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے محبوب تک پہنچ سکتا ہے اور حقیقت میں محبوب کو دوست رکھتا ہے یہ اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو استقلال کی نظر سے نہیں دیکھتا صرف اسے

(۱) ﴿واما بنعمۃ ربک فحدث﴾ سورۃ والضحی ایۃ ۱۱

وسیلہ قرار دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نعمتوں پر خوش نہیں ہے خوش ہے لیکن
اس کی اصل خوشی منعم کی ذات ہے اور اس کا تابع ہو کر وہ نعمتوں پر بھی خوش ہوتا ہے۔
اس لحاظ سے وہ ہر نعمت پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کیونکہ یہ وہ
وسیلے ہیں جو اسے محبوب کی یاد دلاتے ہیں مثلاً مومن مال سے خوش ہوتا ہے کہ اس کے
ذریعے سے وہ خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اولاد کی نعمت پر خوش ہوتا ہے کہ اس
کی تربیت کرے اور اس سے اثر خیر ہو، اور وہ بھی محبوب کو یاد کر سکے۔
خلاصہ کے طور پر نعمت کا شکر یہ ہے کہ وہ نعمت سے منعم کی طرف پرواز کرے
اس ضمن میں شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے
((زمنعم بہ نعمت نپرداختم))

ایسی نعمتوں سے فرار جو عبادت کے لئے مانع ہوں

حقیقی شکر یہ ہے کہ نعمت کو خدا سے قریب ہونے کے لئے چاہے تو کیا ایسے
آدمی موجود ہیں؟
ایسے شکر گزار بندوں کی علامت یہ ہے کہ وہ نعمتیں جو انہیں خدا کی عبادت
سے روکتی ہوں ایسی نعمتوں سے فرار اختیار کرتے ہیں اگر کوئی مال انہیں جماعت سے
اول وقت میں نماز پڑھنے سے روکے تو وہ اس مال کو ٹھکرا دیتے ہیں اور خدا کی یاد کو
مقدم رکھتے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ یہ چیزیں انسان کو خدا سے دور کر دیں (۱) اس بناء پر

---

(۱) یا ایہا الذین آمنوا لا تلہکم ـــ سورۂ منافقون

اگر مقام و منزلت اور دولت خدا کی راہ میں رکاوٹ بنے تو وہ ہرگز اس نعمت کو نہ لے گا
بلکہ اس سے دور ہو جائے گا۔

نعمت کا صحیح استعمال کریں

ہم دوبارہ امام صادقؑ کی روایت کی طرف لوٹتے ہیں جہاں آپؑ فرماتے
ہیں (ولا تخالفہ ولا تعصیہ بنعمتہ) اصلی شکر یہ ہے کہ وہ نعمتیں جو خدا نے تجھے دی ہیں اس
سے مخالفت اور پروردگار کی معصیت نہ کر۔
بعض بزرگان نے فرمایا ہے (صرف العبد جمیع ما انعم اللہ فی ما
خلق لا حلہ) جو بھی خدا نے دیا ہے کسی نہ کسی مقصد سے دیا ہے تو ہمیں چاہئے کہ اسی
مقصد اور غرض کی حصول کے لئے کام کریں اگر ایسا نہیں کریں گے تو کفران نعمت
کریں گے۔ جیسے آنکھ نعمت ہے تاکہ بدن کی حاجت کو دور کر سکیں اور آخرت کی خوشی
حاصل کر سکیں اسی آنکھ سے جسم کی آفات کو دور کر سکتے ہیں جیسے راستے
طرح ہم انہیں آنکھوں سے قرآن پڑھتے ہیں اسی سے ہم مختلف چیزوں سے
میں موجود کنویں سے ہم بچ سکتے ہیں تاکہ ہمارا جسم گرنے سے محفوظ رہے اور اسی
عبرت لیتے ہیں اسی سے ہم نعمت خدا کو دیکھتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں۔
لیکن (خدا نخواستہ) اسی آنکھ سے نامحرموں پر نظر کی کسی کے گھر میں دیکھا۔
اسی سے جاسوسی کی تو یہی کفران نعمت ہے کیونکہ اسے اس کام میں صرف کیا
ہے جس کام کے لئے یہ نہیں بنیں تھیں۔

اسی طرح پروردگار نے کانوں کو ضرورت کی چیزوں کو سننے کے لئے خلق کیا ہے تاکہ قرآن کے معارف الٰہی وغیرہ کو سن سکیں لیکن اگر خدانخواستہ اس سے موسیقی، غیبت، بُرائی اور تہمت سننے کے کام لینے لگے تو یہ کفرانِ نعمت ہے اور ایسے شخص نے کان کی نعمت کا کفران کیا۔

علمِ فقہ صرف نعمت کی تشخیص کرتا ہے

علماء اخلاق میں سے کسی ایک کا کہنا ہے کہ ہمارے ادراکات اس بات سے بہت چھوٹے ہیں کہ ہم نعمتوں کا مقصد جان سکیں تاکہ اس کا شکر بھی ادا کر سکیں، اسی لئے سب سے بڑی نعمت پیغمبر اکرمؐ کی ذات کو خدائے رب ذوالجلال نے خلق کیا تاکہ ہم ان کے بتائے ہوئے فرمان سے حلال، حرام، مستحب، مکروہات کو جان سکیں۔

مثال کے طور سے نماز، زبان اور ہاتھ پاؤں کی غرض کو سمجھاتی ہے لہٰذا نماز نہ پڑھنا ان اعضاء کی کفرانِ نعمت ہے، اگر کسی مظلوم کے چہرے پر طمانچہ ماردیا تو ہاتھ کا کفرانِ نعمت کیا، اسی طرح تمام مکروہات کمترین کفرانِ نعمت ہیں۔

جیسے قبلہ کی طرف رخ کر کے تھوکنا مکروہ ہے اسی طرح شلوار کو قبلہ کی طرف رخ کر کے پہننا مکروہ ہے کیونکہ پروردگار نے کعبہ کو شرف عطا کیا ہے اور کوئی کام جو عرف میں ناروا ہے اسے اس شرف والی جگہ کی طرف رخ کر کے نہیں کرنا چاہئے اور ایسا کرنا کفرانِ نعمت ہے، اسی طرح مسجد میں تھوکنا بھی کفرانِ نعمت ہے۔

اسی وجہ سے ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ ہر مستحب کو انجام دیں اور ہر مکروہات سے بچیں ایسا کرنا خود شکرِ نعمت ہے۔

حضرت امام سجادؑ کی ہشام کے ساتھ گفتگو

علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار کی گیارہویں جلد میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت امام سجادؑ کو ہشام نے دربار میں بلایا ہشام نے جونہی امامؑ کی ظاہری حالت کو دیکھا کہ امام بہت لاغر و ضعیف ہیں تو امامؑ کو طنز کرتے ہوئے کہنے لگا، اے فرزند رسول خداؐ آپ خاندانِ رسالت سے ہیں اپنے آپ کو کیوں اتنی زحمت دیتے ہیں۔

حضرتؑ نے جواب دیا کہ لوگ میرے جد رسول اکرمؐ پر بھی اعتراض کرتے تھے پھر کہتے ہیں کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ اگر میں اول سے آخری عمر تک جتنی دنیا کی عمر ہو اسی طرح میں بھی زندہ رہوں اور ہر روز روزے رکھوں اس طرح میرے پیٹ کی کھال پیٹھ سے مل جائے اتنا روؤں کہ میری پلکیں اور آنکھیں بہہ جائیں تو میں نے خدا کی نعمتوں کا دسواں حصہ بھی شکر ادا نہیں کیا۔

مناجات میں آپ کہتے ہیں کہ اے پروردگار میری بُردباری و حلم بلاؤں کے مقابلے میں کم ہے اور میرا شکر پروردگار کی نعمتوں کے مقابلے میں قلیل ہے۔(۱)

میں کون کون سی نعمتوں کا شکر ادا کر سکتا ہوں، اس نعمت کا جب میں نے اپنی نیکیوں کو فاش کر دیا یا اس نعمت پر کہ جس کی وجہ سے تو نے میرے عیبوں پر پردہ پوشی کی اور مجھے رسوا ہونے سے بچا لیا یا ان بلاؤں کی دوری پر جس سے تو نے محفوظ رکھا اے خداوند مجھے میری ناشکری پر نعمتوں سے محروم نہ فرما اور مجھے شکر گزاری کی توفیق عطا فرما۔

---

(۱) صحیفہ سجادیہ

درس (۴۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ○ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ○ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ﴾

''اور تم نے اپنی روزی یہ قرار لی ہے کہ (اسکو) جھٹلاتے ہو تو کیا جب جان گلے تک آ پہنچی اور تم اس وقت (کی حالت) پڑے دیکھا کرتے ہو''

رزق کو خدا سے نہ سمجھنا کفر ہے

کوئی یہ کہے کہ میں کام کرتا ہوں اور اپنے زور بازو سے کماتا ہوں، یعنی وہ اپنے بازو کو، اپنی طاقت کو یا اپنی زبان اور قلم کو رزاق سمجھتا ہے تو ایسا شخص کفر کرتا ہے۔

کیا شکم مادر میں رزق کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں چلاتے تھے (کام کرتے تھے) کیا دنیا میں آنے کے بعد تم نے ماں کے سینے میں دودھ کو ایجاد کیا ہے

اور اب اپنے آپ کو ان چیزوں کا رازق سمجھنے لگے ہو اور منعم (نعمت دینے والے) کو نہیں پہچانتے؟ کیا تم اپنے کاموں میں مستقل ہو اور کسی کی سرپرستی میں نہیں ہو!

﴿فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ﴾

''پس جب جان گلے تک پہنچ چکی ہو تو کیوں کچھ نہیں کر سکتے''

اور ان محبتوں کے باوجود جو تمہیں اپنے ماں، باپ رشتے داروں سے ہے پھر بھی جب ان کی جان نکل رہی ہو تو کیوں نہیں بچا سکتے! اور ان کی جانوں کو واپس کیوں نہیں کر دیتے؟

جان لینے میں حق کا لطف

جان پاؤں سے نکلنا شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ سر تک پہنچتی ہے یہاں بعض مفسرین نے بڑا ہی لطیف نکتہ ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب جان پاؤں سے نکل چکی ہو اور ابھی تک سانس کی آمد و رفت باقی ہو تو یہ انسان کتنا عاجز ہو جاتا ہے(۱) اور اپنے آپ کو کتنا بے بس محسوس کرتا ہے اور جب انسان بے چارہ ہو جائے تو ایسے موقع پر خلوص دل سے یا اللہ کہتا ہے اور خدا کے یکتا ہونے کی گواہی دیتا ہے شہید ثانی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ اگر کسی کے مرنے کے وقت کا آخری جملہ ﴿لا الہ الا اللہ﴾ ہو تو اس شخص پر جنت واجب ہے(۲) اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہو وہ شخص اہل نجات میں سے ہے اگر چہ بہت مدتوں تک برزخ کے

(۱) سورۂ قیامت آیۃ ۲۶ (۲) من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ معہ (فی احکام الموت)

عذاب میں ہو، پھر بھی جنتی ہے۔ اگر زبان حرکت نہ کر رہی ہو تو دل میں بھی کہنا کافی ہے اور مستحب ہے کہ وہ افراد جو اس وقت موجود ہوں اس کو تلقین کریں کہ وہ یاد خدا کرے بلکہ امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ وہ کلمہ شہادت اشہدان محمداًرسول اللہ کا اہتمام زیادہ کریں اس لئے کہ یہاں پر خدا کی وحدانیت کے اقرار کے علاوہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی رسالت کا اقرار بھی ہے تا کہ اس شخص کی رسول اللہؐ کے ساتھ دوستی تازہ ہو جائے۔

﴿وَاَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ﴾

"تم لوگ اس وقت دیکھتے (اور تمہارا دل جل رہا ہوتا ہے) اور تم بہت چاہتے ہو کہ اس کی جان واپس کردو"

لیکن اس میں تم بہت عاجز ہوتے ہو اور تمہاری بے بسی تمہارے درمیان واضح ہو جاتی ہے اور اسی طرح قادر مطلق کی قدرت بھی آشکار ہو جاتی ہے اے وہ کہ جس کی قدرت مرتے وقت واضح اور آشکار ہو جاتی ہے(۱) اور کسی ڈاکٹر اور دوائی سے کام نہیں بنتا حتیٰ کہ دعا بھی مستجاب نہیں ہوتی۔

ہم مرنے والے سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک ہیں

﴿نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَا تُبْصِرُوْنَ﴾

"ہم اس محتضر (مرنے والے) سے تم لوگوں کی نسبت زیادہ نزدیک ہیں"

(۱) وسائل شیعہ ج ۲ ص ۶۶۳

تمہاری نزدیکی جسمانی ہے جب کہ ہماری روحانی ہے قرآن کی تعبیرات کے مطابق جب بھی پروردگار وسیلے سے کام انجام دے تو نحن (ہم) اور جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے اور جب بلاواسطہ کام انجام دے تو میں (واحد) کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ مرتے وقت ملائکہ حاضر ہوتے ہیں اگر مرنے والا مومن ہے تو رحمت کے فرشتے، اور اگر کافر ہے تو عذاب دینے والے فرشتے موجود ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں جان لینے کے بارے میں پروردگار نے نحن کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی عزرائیل اور ان کے اعوان بھی تم لوگوں سے نزدیک ہیں لیکن تم لوگ نہیں دیکھ سکتے کیونکہ تمہاری آنکھیں مادی اور ظاہر جسموں کو دیکھتی ہیں اور یہ ایک چھوٹی آنکھ ہے جو کہ مجردات کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ ہاں اس وقت جب برزخ میں آنکھ کھلے گی اور پردے ہٹ جائیں گے تو اس وقت ملائکہ کو دیکھو گے اسی طرح انوارِ طیبہ محمد آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مشاہدہ کرو گے اور مومن ان جمال طیبہ اور اپنے محبوب کے دیدار کے شوق میں جان دیدیگا۔

پروردگار سے ملاقات کی خوشی

ایک شخص امام صادقؑ کی خدمت میں آکر سؤال کرتا ہے، کہ آپؑ فرماتے ہیں جو بھی پروردگار سے ملاقات کی خوشی رکھے تو خدا بھی اس کی لقاء سے خوش ہوتا ہے اور جو شخص خدا سے ملاقات کو خوشی نہ سمجھے تو خدا بھی اس کی لقاء سے خوش نہیں

(۱) من احب لقاء اللہ ۔۔۔ بحار الانوار جلد ۳

ہوتا(۱) ہم دیکھتے ہیں کہ جان نکلنا ہمارے لئے سخت ہے کیونکہ ہم لوگ موت سے ڈرتے ہیں تو کیا ہم بھی ان میں سے ہیں جو لقاء اللہ سے کراہت رکھتے ہوں؟۔ حضرت نے جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا دوست وہ نہیں ہے جو خدا سے لقاء پر خوش نہ ہو اور جب وہ مرتا ہے تو مرتے وقت ہمارے جد حضرت رسول خدا اور حضرت علی مرتضیٰؑ، حضرت حسینؑ، حضرت زین العابدینؑ اور محمد بن علیؑ (باقرؑ) کو دیکھتا ہے اور ان کے انوار کے وصال میں اپنی جان دیتا ہے اور اسی حال میں اس کی روح قبض کی جاتی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کسی ہوا کی مانند اپنی دنیا کو بھول کر بہشت اور بہشتیوں میں مصروف ہو جاتا ہے(۱) اسی طرح دوسری روایت میں ہے کہ جن امام قسم کھا کر فرماتے ہیں میں قسم کھاتا ہوں کہ ہمارا کوئی شیعہ نہیں مرتا مگر یہ کہ اسے حوض کوثر کا ذائقہ چکھا دیا جائے (۲)

---

(۱) بحار الانوار جلد۳ (۲) بحار الانوار

درس (۴۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَ لَكِن لَّا تُبْصِرُونَ﴾

''ہم اس مرنے والے سے تم سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں لیکن تمہیں دیکھائی نہیں دیتا''

کل رات کی گفتگو ﴿لَا تُبْصِرُونَ﴾ کے بارے میں تھی آج کی رات بھی ہم اسی مطلب کی تائید میں مقدمہ کے طور پر کچھ عرض کریں گے۔

انسان میں تمام عالم کے ادراک کی قوت موجود ہے

خداوند کریم نے انسان کو تمام عوالم کے ادراکات کی قوت عطا فرمائی ہے عالم غیب و شہادۃ، ملک و ملکوت اور اسی طرح دنیا و آخرت سب پر ادراک رکھتا ہے البتہ جس عالم میں ہو اسے بالفعل جانتا ہے جب کہ دوسرے عالم جس میں ابھی نہ گیا

ہواس کے ادراک کی صرف قوت موجود ہے جیسے کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتو اس میں عالم دنیا (یعنی خارج از رحم) کے ادراک کی قوت موجود ہے لیکن اسے جاننا اس وقت ہے جب دنیا میں آ جائے۔

جس طرح کھجور کا بیج بالقوۃ درخت ہے یعنی ممکن ہے کہ ایک بیج آخر میں درخت بن جائے اسی طرح بچے میں بھی دیکھنے کی قوت سننے کی قوت اور چکھنے کی قوت موجود ہے لیکن یہ سنتا اور دیکھتا اور چکھتا اس وقت ہے جب دنیا میں قدم رکھے ماں کے پیٹ میں تو صرف استعداد ہی موجود ہے۔

انسان کے اندر بھی وہ چیزیں ابھی عالم دنیا میں غائب ہیں اسے جاننے کی صلاحیت موجود ہے جیسے کہ ملائکہ کو ادراک کرنا جہنم اور جنت کو ادراک کرنا یہ سب اس کے لئے ممکن ہے لیکن جب وہ مر جائے گا اور اس عالم میں جائے گا تو یہ سب چیزیں اس کے لئے فعلی ہو جائیں گی اور وہ سب کو درک کرنے لگے گا جیسے کہ بچہ رحم مادر سے باہر آنے کے بعد سب چیزیں جاننے لگتا ہے جیسے کہ نعمت کا ادراک کرنا لطیف ہے یہ سب بشر کی فعلیت سے خارج ہے لیکن اس میں اس کے حصول کی قوت اور استعداد موجود ہے کہ یہ کون عطا کر رہا ہے۔

بعض کوتاہ نظر جب دیکھتے ہیں کہ یہ ساری چیزیں (ملکوت، جنت، جہنم) انہیں نظر نہیں آتی تو بجائے یہ کہنے کہ یہ سب چیزیں انہیں معلوم نہیں ہیں یہ کہتے ہیں کہ اصل میں ہے ہی نہیں یعنی ان کے وجود کا انکار کر دیتے ہیں گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ

چیزیں جنہیں ہم آنکھوں سے نہ دیکھ لیں یا اسے سن نہ لیں، اس پر کیسے یقین کر لیں گویا جب ہم نے انہیں محسوس ہی نہ کیا تو پھر وہ نہیں ہیں حالانکہ کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جنہیں ہم محسوس نہیں کرتے اس کے باوجود وہ ہیں جیسے کہ کسی بزرگ کا کہنا ہے کہ ایسے لوگوں سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس عقل ہے اگر وہ کہیں کہ نہیں تو پھر ایسے لوگوں سے بات کرنا ہی بے کار ہے اگر وہ کہیں کہ عقل ہے تو پھر ان سے کہو کہ ہمیں دکھاؤ کہ کہاں ہے اگر نہیں دکھا سکتے تو پھر عقل نہیں ہے!

غیب کا انکار کرنا فکر کی کوتاہی ہے

طنطاوی نے (جو کہ مشہور مفسر ہیں) ہمارے ادراکات کے چھوٹے ہونے کے بارے میں بہت عمدہ مثال ذکر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں ہماری اس عالم میں حیثیت ایک چیونٹی کی مانند ہے جو کسی بیابان میں کسی ٹیلیگراف کے کھمبے سے گذر رہی ہو کیا اس چیونٹی کو معلوم ہے کہ وہ کس چیز پر سے گزر رہی ہے اور وہ کتنی اہم چیز ہے؟۔ اس دنیا میں عالم غیب کے بارے میں ہماری اطلاعات بھی اس چیونٹی سے زیادہ نہیں ہے اور ہمارے پاس سوائے وحی کے اور کوئی چارہ نہیں ہے، البتہ ان تمام باتوں کو ہم عقل کے ذریعے سے ثابت کر چکے ہیں لیکن ان کی خصوصیات پیغمبر کی اور ان کے اوصیاء کی وجہ سے ہم تک پہنچی ہے۔

وہ لوگ جو ملائکہ وجنات، شیاطین اور دوسرے عالم کے منکر ہیں ان کی فکر انتہائی حد تک کوتاہ ہے کیونکہ یہ واضح سی چیز ہے کہ (عدم الوجدان لا یدل علی

عدم الوجود) نہ پانا نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے۔ اگر کوئی کہے کہ بینک میں میرا کوئی اکاؤنٹ نہیں تو اس کا یہ کہنا اس بات دلیل نہیں کہ میرے پیسے بینک میں نہیں اس لئے دنیا میں پیسے ہی نہیں ہیں، اس طرح کہنا عقلمندی کی دلیل نہیں ہے۔

(انما یعرف عقل الرجل بکثرۃ محتملاتہ) انسان کی عقل اس کے محتملات کی کثرت کو بیان کرنے میں پہچانی جاتی ہے جب تک وہ احتمالات دے سکتا ہے دے یعنی وہ یہ کہتا رہے کہ ایسا ہو سکتا ہے یا ویسا ہو سکتا ہے یعنی امکان ہے جب تک کوئی قطعی دلیل اس کے خلاف نہ آجائے وہ احتمالات کو دیتا رہتا ہے، (لیکن یہ لوگ سرے سے ہی قیامت، کا انکار کر دیتے ہیں)

﴿وَ لٰکِنْ لَا تُبْصِرُوْنَ﴾ یہ ظاہر آنکھ کی وسعت بہت ہی محدود ہے، جب کہ چشم برزخی ملکوتی اعماق کو بھی دیکھ سکتی ہے اور تمام اعمال کو دیکھتی ہے اپنے اخلاق وغیرہ کو دیکھتی ہے۔

عالم ملکوت کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی موجودات میں تکرار نہیں ہے، نعمت پر نعمت ہے، تجلی پر تجلی ہے، رحمت پر رحمت ہے، نور پر نور ہے اسی طرح (خدانخواستہ) اگر کوئی ظلمت میں ہو تو پھر ہر ظلمت پر ظلمت کو اضافہ کیا جائے گا(۱)

(امام علیہ السلام) سے پوچھا گیا، کہ کس طرح ممکن ہو سکا کہ امام حسینؑ کے اصحاب ایک دوسرے سے زیادہ شہادت کے مشتاق تھے اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

---

(۱) سورۂ نباء ۸۷ آیۃ ۴۰

آپؑ نے فرمایا کہ شب عاشور امام حسینؑ نے معجزے کے ذریعے سے ان لوگوں کی آنکھوں سے پردوں کو ہٹا دیا اور ان کے مقامات کو انہیں دکھلایا اس وجہ سے وہ اتنا مشتاق تھے کہ کب ان کے قفس عنصری سے ان کی روح پرواز کر جائے (۱) اور وہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہمارے درجات میں اور ہم میں زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا۔

﴿فَلَوْلَا اِنْ کُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ تَرْجِعُوْنَهَا اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ﴾

''اگر قیامت نہیں ہے تو مردے کو زندہ کر لو''

بعد والی آیت پر استدلال کیا گیا ہے اگر تم قیامت کے منکر ہو (روز جزاء کے منکر ہو) تو محتضر (مردے) کی روح کو واپس کر کے دیکھو کہ کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔

''﴿مَدِیْنِیْنَ﴾ دین سے مشتق ہے اور یہ جزاء کے معنی میں ہے ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ یعنی روز جزاء کے مالک، خدا فرماتا ہے کہ اگر تمہیں جزاء نہیں دی جائے گی تو پھر قیامت بھی نہیں ہوگی تو پھر اپنے مردے (مرنے والے) کو اگر تم بچالو۔

بندے نہیں ہو اور تمہارا کوئی مولیٰ بھی نہیں ہے اور خود سر ہو تمہارے کاموں سے باز پرس نہیں کی جائے گی اور تمام کام تمہارے ہاتھوں سے ہی ہوں گے خلاصہ کو طور پر اگر تم سچے ہو اور تمہارا مدعا سچ ہے اور ﴿اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ﴾ کہ اگر تم

---

(۱) بحار الانوار جلد ۱۰

سچے ہوتو مرنے والے کی روح کو واپس لے آؤ اس کی جان بچالو۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا مرتے وقت سب کچھ آشکار ہو جائے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ ﴿لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ﴾ کہ اللہ کے سواء کسی کے پاس قوت نہیں ہے اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے اسماء الٰہی جو کہ دعاء جوشن کبیر میں بیان ہوئے ہیں ایک صفت ی (یا من فی الممات قدرتہ) کہ پروردگار تیری قدرت مرتے وقت معلوم ہو جائے گی جب کسی کی مدد کام نہ آئے گی اور دوست، رشتہ دار قوم قبیلے والے کچھ نہیں کرسکتے سب جانتے ہیں اور خدا کی قدرت کا نظارہ کرتے ہیں۔

کیا آپ نے کبھی کسی مرنے والے کو واپس آتے ہوئے دیکھا ہے، پس جان لو کہ سب پر اس کی قدرت اور سب بندے ہیں وہی مولیٰ ہے وہ خالق ہے اور سب اس کی مخلوق ہیں، بڑے بڑے بادشاہ ایک لحہ بھی اپنی زندگی میں اضافہ نہ کرسکے بڑے بڑے طبیب اپنی زندگی نہ بچاسکے۔

بادشاہوں میں کوئی حکمران بنی عباس کے ہارون الرشید سے زیادہ بڑی سلطنت کا حکمران نہیں گزرا ہے لیکن وہ بھی کتنی زندگی گزار کر گیا صرف (۴۷ سال) اور بس اے لوگوں یہ نمونہ سب کے لئے روشن ہے اور مرتے وقت روشن تر ہو جائیگا۔

حضرت سلیمانؑ کو بھی مہلت نہ ملی

حضرت امیر المومنین امام علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں اگر تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کی موت ٹل جائے اور وہ موت سے فرار کر سکے تو اسے چاہئے کہ وہ

حضرت سلیمانؑ کی طرح سے ہو (کیونکہ کسی کی حکومت بھی حضرت سلیمانؑ کی طرح نہ تھی وہ تمام چیزوں پر حاکم تھے اور حیوانات کے بھی بادشاہ تھے) جب حضرت سلیمانؑ نے اپنی زندگی کا آخری قطرہ پانی اور آخری لقمہ کھالیا تو وہ بھی اس دنیا سے چلے گئے۔

سلیمان کہاں ہیں؟ ان کی سلطنت کہاں گئی، ان کی بساط ختم ہوگئی جب حضرت سلیمانؑ کی یہ حالت ہے تو پھر اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔

عیون اخبار الرضا میں کچھ مطلب اس ضمن میں حضرت امام رضاؑ سے ذکر کئے گئے ہیں روایت کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے حضرتؑ نے فرمایا کہ جناب سلیمانؑ نے کہا کہ کل میں چاہتا ہوں کہ استراحت کروں اور کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ میرے پاس آئے یہ کہہ کر حضرت سلیمانؑ چھت پر چلے گئے اور عصاء سے تکیہ لیکر آرام کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں کسی کو دیکھا تو فوراً پوچھا کہ تجھے کس نے یہاں آنے کی اجازت دی اور تو کون ہے تو اس نے جواب دیا صاحب خانہ۔

حضرت سلیمانؑ فوراً سمجھ گئے یہ ملک الموت ہے حضرت سلیمانؑ نے سوال کیا کہ کس لئے آئے ہو تو اس نے جواب دیا آپ کی جان لینے کی غرض سے آیا ہوں اور اسی لمحے ان کی جان لے لی انہیں بیٹھنے کی بھی اجازت نہ ملی اور اس قیام کی حالت میں ایک سال تک رہے اور کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ ان کے پاس جاسکے ایک سال تک ان کی حکومت اسی طرح چلتی رہی لیکن ایک سال کے بعد دیمکوں نے جب ان کے عصاء کو چاٹ ڈالا اور اس کی وجہ سے عصاء گر گیا تو حضرت سلیمانؑ بھی

نیچے گر گئے تو اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ انتقال کر چکے ہیں اس کے بعد انہیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔

امام علیؑ حضرت سلیمانؑ کو بطور مثال بیان کر رہے ہیں کہ اگر تمہیں موت سے بچنا ہے تو حضرت سلیمانؑ کی طرح بن جاؤ پھر بھی تمہیں موت سے مہلت نہ ملے گی تو پھر اپنے بارے میں خود فکر کرو اور ہوشمندی سے کام لو۔

درس (۵۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿فَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ٥ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ ٥ وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ ٥ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ ٥ وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّالِّيْنَ ٥ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ﴾

”پس اگر وہ مقربینِ خدا میں سے ہے تو اسکے لیے آرام آسائش ہے اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں ہے تو (اسے کہا جائے گا کہ) تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام ہو اور اگر جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو (اسکی) مہمانی کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں داخل کر دینا“

لوگوں کی طرح موت کی بھی تین قسمیں ہیں

یہ آیت شریفہ ان لوگوں سے مخاطب ہے جو مسبب الاسباب کے منکر ہیں اگر تم لوگ سچے ہو تو مرنے والے کی روح کو واپس پلٹا دو۔ وہ لوگ جو کسی دوا کو

بیماری کے علاج کے لئے موثر جانتے ہیں (اگر بیماری اس دوا سے ختم ہو جائے) اور اگر مال میں اضافہ ہو تو اسے اپنی کوشش قرار دیتے ہیں، اگر زلزلہ آجائے تو اسے زمینی بخار کی وجہ قرار دیتے ہیں، یہ لوگ عالم غیب اور مبدء تعالیٰ سے بے خبر ہیں۔

اے ڈاکٹر، اے پروفیسر اور اے اسکالرز اگر تم خدا کے تابع اور بندے نہیں ہو تو زرا اس مردے کی روح کو پلٹا کر تو دکھاؤ یہ سارے بیانات کے بعد پھر موت کی قسمیں بتائی جارہی ہیں یعنی جان دینے کی کیفیت کو بیان کیا جارہا ہے کہ یہ تین قسموں پر ہیں جیسے کہ لوگوں کے اعمال کے حساب سے تین قسمیں ہیں جو کہ اوّل سورہ میں بیان کردی گئیں۔

(۱)(سابقین) (۲)(اصحاب یمین) (۳)(اصحاب شمال)

اگر وہ مردہ (انسان مقربین میں سے یعنی سابقین میں سے ہو تو اس کی قبر کسی حجلہ عروسی کی مانند ہے (یعنی بغیر کسی عذاب کے ہوگی) ﴿فَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ پس اگر وہ مرنے والا ﴿مُقَرَّبِيْنَ﴾ (خاص) بندوں میں سے ہو تو ﴿فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ﴾ اس کے لئے راحتی (آرام) ﴿رَيْحَانٌ﴾ اچھی خوشبو اور جنت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا میں کونسا ایسا دولھا ہوگا جسے اس شان سے لے جاتے ہیں جیسا کہ ﴿مُقَرَّبِيْنَ﴾ کو لے جاتے ہیں ایک روایت کے مطابق جو کہ حضرت رسول خداؐ سے ہم تک پہنچی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ (۷۰۰۰۰ ستر ہزار) فرشتے اس (مرنے والے) کے

---

(۱) (اذا مات المؤمن شیعہ سبعون الف ملک ... لئالی الاخبار ص۲۰)

پیچھے چلتے ہیں اور ان سب کے ہاتھوں میں بہشتی پھولوں کا ایک گلدستہ ہوتا ہے(۱) برزخ میں بھی اس کے لئے ہر وقت نئے نئے الطاف و اکرام الٰہی ہوں گے اور جن کی تکرار سے اکتاہٹ نہیں ہوگی۔ روح کے دوسرے معنی میں سے ایک کا معنی حیات (زندگی) ہے یعنی ما بہ الحیاۃ) (جس کے ذریعے سے حیات قائم ہو) اسے روح کہتے ہیں مومن کی حقیقی حیات یہ ہے کہ پہلے جان دے پھر وہ (حقیقی زندگی میں وارد ہو) وہ جب تک اس مادی زندگی میں ہوگا ہر وقت بلاؤں میں گرفتار رہے گا اور مومن بندے کے لئے اس سے نجات حاصل کرنے کا وقت موت کا وقت ہے۔

اے کاش میرے احباب جانتے

کچھ حدیثیں تفسیر برہان میں ہم تک پہنچی ہیں جیسا کہ روایت کا مضمون ہے کہ جب مومن حالتِ احتضار (مرنے کا وقت) میں ہو الطافِ الٰہی کو دیکھتا اور اس کو پالیتا ہے اس کے بعد وہ اجازت چاہتا ہے کہ اب لواحقین کے پاس جائے اور انہیں اس بات کی اطلاع دے۔

سورۂ یٰسین میں پروردگار مومن کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ مرتے وقت کہے گا اے کاش میری قوم جانتی کہ خدا نے میرے ساتھ کیا معاملہ کیا، مجھے بخش دیا، اور مجھے ان میں سے قرار دیا کہ جن پر کرم کیا ہو۔

یہ جان دینے والے ﴿مُقَرَّبِيْنَ﴾ اور ﴿سابقین﴾ ہیں جو حقیقت میں علی کے خاص شیعہ ہیں یہ لوگ پاک ہیں یہ رجس اور شرک سے پاک ہو گئے ہیں اور ان

کے دلوں میں ایمان اور نورولایت آلِ محمدؐ کے سوائے کچھ نہیں ہے یہ باطنی نجاسات سے بھی پاک ہوگئے ہیں، حبِ دنیا، کینہ، حسد، وغیرہ ان میں نہیں اور علمِ معرفت میں علم الیقین بلکہ حق الیقین تک پہنچے ہوئے ہیں اور مقامِ عمل میں اخلاص تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں(۱)

اصحاب یمین بھی آرام سے مریں گے

اگر کوئی ﴿مُقَرَّبِین﴾ میں سے ہو تو اس کی جان آسانی سے نکلتی ہے جب کہ اگر کوئی شخص مقرب نہ ہو لیکن اس کی نیکیاں اس کی بُرائیوں سے زیادہ ہوں تو ایسا شخص اصحاب یمین میں سے کہلائے گا یمین سے مراد محبانِ علی ابن ابی طالبؑ ہیں۔

اس آیت کے ضمن میں شرح کو خود امامؑ کے حدیث کے ضمن میں بیان کریں تو بہت بہتر ہے۔ مولیٰ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں مرنے والوں کی تین قسمیں ہیں یا تو اس کو مرتے وقت نعمتِ جاودان کی خوشخبری سنائی جائے گی یا اسے ہمیشہ عذاب میں رہنے سے ڈرایا جائے گا یا پھر وہ خوف وہراس میں ہوگا یعنی ایسا شخص نہ مقرب ہوگا نہ کافر بلکہ یہ ﴿اصحاب یمین﴾ میں سے ہوگا ایسا شخص علیؑ کو بھی دوست رکھتا ہوگا اور مال دنیا کو بھی، یہ مال و مقام کا بھی چاہنے والا ہے اور عبادت بھی کرتا ہے تو ایسے شخص کو مرتے وقت حیرانی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ ہم لوگ خود ہی ایسی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے ہیں کہ موت کی فکر نہیں کرتے تا کہ موت سے پہلے اس کا تدارک کیا جائے جب کہ متقی لوگ

---

(۱) الا عبادك المخلصين سورۃ حجر آیۃ ۴۰

اپنی موت کے وقت سے پریشان رہتے تھے۔

البتہ ﴿مُقَرَّبِین﴾ کی طرح اصحاب کے بھی مختلف درجات ہیں اور ان کے مختلف مراتب ہیں ان میں سے اعلیٰ مرتبے والے ایسے ہیں جن کی زندگی اور روح آلِ محمد کے ساتھ ہے۔

روزِ عاشورا امام حسینؑ کی یومِ فتح ہے

سید ابن طاؤسؒ اپنی کتاب اقبال الاعمال میں فرماتے ہیں امام حسینؑ کے لئے عاشورا حقیقت میں فرحت کا دن ہے جس دن آپؑ اپنے محبوب اور مقصود تک پہنچ گئے، اور اگر ہمیں عزاداری اور غم کا حکم نہ ملتا تو یہ فتح کا دن ہوتا، لیکن یہ مصیبت تمام عالم میں بہت عظیم ہے اور پھر اس سے شعائرِ مذہبی اور برکات وابستہ ہیں اس لئے ہمیں ہر صورت میں عزاداری کرنا چاہئے۔

واقعی روز عاشورا امام حسینؑ کے راحت میں ہونے کا دن ہے جیسا کہ ان کے اصحاب کے لئے بھی ایسا ہی ہے اور جو بھی ﴿مُقَرَّبِین﴾ میں سے ہو اس کے لئے جان دینا اولین ﴿روح وریحان﴾ ہے یعنی اسی کے لئے اس دنیائے فانی سے اور اس کے شر سے چھٹکارے کا دن ہے۔

اسی وجہ سے امام علی ابن ابی طالبؑ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم ابوطالب کے بیٹے کو موت سے اتنی اُنسیت ہے جتنی کہ ایک اونٹ کے بچے کو اپنی ماں کے پستانوں سے ہوتی ہے، امام علیؑ ایسے ہیں تو جو شخص آپؑ سے وابستہ ہے اسے اپنی حد تک ایسا ہی

ہونا چاہئے۔

جنت نعیم قیامت میں ﴿مُقَرَّبِین﴾ کے لئے

﴿رَیحَان﴾ جنت کے رزق ، پھول ،اور خوشبو کے معنی میں آتا ہے ﴿روح و ریحان﴾ مرتے وقت ،موت اور برزخ کے لئے ہے جب کہ جنت نعیم قیامت کے لئے ہے روایت میں ہے کہ جب کسی علیؑ کے شیعہ کے جنازے کو اٹھایا جاتا ہے تو (۷۰۰۰۰ ستر ہزار) فرشتے اس کی تشیع میں شریک ہوتے ہیں ان میں ہر فرشتوں کے ہاتھوں میں ایک گل دستہ ہوتا ہے اور یہ اس کی روح کو آسمانوں کی طرف لے جاتے ہیں اور جس آسمان کی طرف بھی بڑھتے ہیں تو اس آسمان کے ملائکہ کہتے ہیں کہ اس روح کی کتنی خوشبو ہے اسی طرح یہ فرشتے تمام آسمانوں سے گزر کر اس مومن کی روح کو عرش الٰہی تک لے جاتے ہیں(۱) دوسرا گروہ (اصحاب یمین) کا ہے جو ﴿مُقَرَّبِین﴾ کے درجے تک نہیں پہنچتے لیکن ایمان والے باعمل اور متقی ہیں یہ عبادات اور واجبات کو انجام دیتے ہیں۔

لیکن یہ قرب کے مقام تک پہنچتے انکے نیک اعمال غالب اور ان کے نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے اور ان کے نامۂ اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا اگر چہ خالص علیؑ کے شیعہ نہ بھی بن سکے لیکن ان کے دوست تو ہیں۔

﴿فَسَلَامٌ لَّکَ مِنْ أَصْحَابِ الْیَمِینِ﴾ پس تم پر اے اصحاب یمین سلامتی ہو، بعض نے کہا ہے کہ لک مرنے والے سے خطاب ہے جو اصحاب یمین میں سے ہو پس سلام ہو اے مومن اصحاب یمین پر اور اے اصحاب یمین تو ہر طرح کی ناراحتوں

---

(۱) بحار الانوار جلد ۲

اور غم سے اور اس عالم کے درد سے امان میں ہے اور تیرے لئے نجات ہے۔

اصحاب یمین کی سلامتی اور علامہ حلیؒ کا خواب

علامہ حلیؒ سے منقول ہے کہ ایک روز انہوں نے ایک سچا خواب دیکھا وہ کہتے ہیں حلہ (ان کا آبائی وطن) میں ایک روز میں فاتحہ پڑھنے کے لئے قبرستان گیا ایک قبر سے گزر رہا تھا تو دیکھا کہ اس پر لکھا تھا کہ فلاں سید (جو کے حلہ کا نہ تھا) میں چاہتا تھا کہ اسے پہچانوں کہ یہ صاحب قبر سید کس حال میں ہے اور کون ہے دوسری رات میں نے خواب میں ایک جلیل القدر سید کو دیکھا جو کہ کہہ رہے تھے میں وہی سید ہوں جس کی قبر تم نے دیکھی اور خدا سے چاہا کہ مجھے پہچانو میں ہندوستان کا رہنے والا تھا اور علم دین حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان سے عراق آیا تھا اور اس لئے حلہ آیا (اس زمانے میں حلہ حوزۂ علمیہ تھا) اور حلہ کے کسی مدرسہ میں تحصیل علم میں مصروف ہو گیا اور کسی کو میری حالت کی خبر نہ تھی ایک روز میں بیمار ہو گیا اور نہایت فقر وفاقہ میں تھا اور بیماری بھی لگ گئی اور میرا تمام بدن میں سخت درد ہو رہا تھا میں کمرے کے کسی گوشے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا ناگاہ میں نے ایک نورانی آدمی کو دیکھا ان کے دیکھتے ہیں مجھے کچھ آرام ملا وہ میرے پاس آئے اور میری احوال پرسی کی میں نے کہا کی مجھے بہت درد ہے اور بہت سختی میں ہوں انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر کو بلاؤں اسی لمحہ ایک اور آدمی کمرے میں آگیا وہ اتنا حسین اور خوشبو دار تھا کہ میں اپنے آپ کو ہی بھول گیا اس نے ہاتھ کو پاؤں پر لگایا تو پاؤں کا درد بالکل ٹھیک ہو گیا

پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو اوپر کی جانب مس کیا تو مجھے کافی آرام مل گیا اسی طرح وہ ہاتھ اوپر کی جانب مس کرتا رہا یہاں تک کہ گردن تک جب اس نے اپنے ہاتھوں کو مس کرلیا تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے بند سے بالکل آزاد ہو گیا ہوں جسم میں درد بھی نہیں ہو رہا ہے۔اس وقت ایک طالب علم میرے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور فریاد کرتا ہے کہ ہائے یہ غریب سید مر گیا پھر سب غسل وکفن کا انتظام کرتے ہیں لیکن جب یہ مجھے قبر میں لے جانے لگتے ہیں تو مجھ پر عجیب سی شدت طاری ہو جاتی ہے جیسے کہ کسی انسان کو کسی پہاڑ سے پھینکا جا رہا ہو۔اور ناگفتہ بہ نہ رہ جائے کہ وہ شخص جو پہلے میرے کمرے میں آیا تھا وہ اس سید کے نیک اعمال ملکوتی صورت میں تھے جب کہ دوسرا شخص جو بہت زیبا تھا عزرائیل فرشتہ ملک الموت تھا۔

ملک الموت کی صورت اشخاص کے اعتبار سے ہے

جاننا چاہئے کہ ملکُ الموت کی صورت مرنے والے شخص کی نسبت مختلف ہوتی ہے اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جس میں حضرت ابراہیم اور عزرائیل (ملکُ الموت) کے درمیان گفتگو ہے، حضرت ابراہیم ملکُ الموت سے کہتے ہیں تمہاری صورت کافروں کی روح قبض کرتے وقت کیسی ہوتی ہے اسے دیکھنا چاہتا ہوں ملک الموت نے کہا کہ آپ وہ صورت برداشت نہیں کر سکتے حضرت ابراہیم نے کہا کہ مجھے دکھاؤ تو عزرائیل نے وہ چہرہ دکھایا تو ابراہیم غش کھا گئے اسکے بعد عزرائیل مومن کی روح قبض کرتے وقت جو صورت ہوتی ہے اختیار کرلی حضرت ابراہیم نے کہا کہ

اگر کافر کے لئے کوئی اور عذاب نہ بھی ہوتا تو اس صورت کے ساتھ تیری ملاقات اس کے لئے کافی تھی (١) ہم دوبارہ اپنے موضوع پر آتے ہیں کہ اگر کوئی علیؑ کا خصوصی شیعہ نہ بھی بن سکے لیکن محب علیؑ ہو اور اس کی نیکیاں اس کے گناہوں پر بھاری ہوں تو وہ اصحاب یمین میں سے ہے اور سلام ہو اس اصحاب یمین پر کہ جس پر برزخ کے عذاب سے سلامتی اور امان ہے۔

دوزخ کا دروازہ، پہلی خاطر تواضع

﴿وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ فَنُزُلٌ مِنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ﴾ (لیکن وائے ہو اس تیسرے گروہ پر) اگر یہ مرنے والا ان جھوٹوں میں سے ہو جو کہتے ہیں کہ بس یہی عالم ہے آخرت کو کس نے دیکھا ہے اور اس کو کس نے بیان کیا ہے یہ سب باتیں پرانی ہو گئی ہیں یہ کہنے والا ایسا شخص ہے جو گمراہ ہے ور اصحاب شمال میں سے ہے۔

البتہ اصحاب شمال کے بھی مراتب ہیں اس کا شدید مرتبہ کفار کا ہے، دوسرا مرتبہ اس مسلمان کا جو بے باک ہے اور گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے، پس ﴿فَنُزُلٌ مِنْ حَمِيمٍ﴾ برزخ میں اور ﴿تَصْلِيَةُ جَحِيمٍ﴾ قیامت میں ہے۔

﴿نُزُل﴾ پہلی پہلی پذیرائی اور پیشکش کے معنی میں ہے جیسا کہ جب کوئی مہمان کسی کے گھر جائے تو اسے جو چائے، پانی یا شربت پیش کیا جاتا ہے وہ

(١) بحار الانوار جلد ٣ ابواب موت

﴿نزول﴾ کہلاتا ہے۔

﴿مُکَذِّبِیْن﴾ (جھوٹوں) کی جو نزول (پذیرائی) ہوگی وہ حمیم سے ہوگی، قبر کے دروازوں میں ایک دروازہ ہوگا جس سے آگ نکلے گی اور تمام قبر کو بھر دے گی اور تصلیہ یعنی ہمیشہ رہنا، پس قیامت میں یہ لوگ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

درس (۵۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ ○ فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ ○ وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ○ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَ تَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ﴾

''اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں ہے تو (اسے کہا جائے گا کہ) تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام ہو اور اگر جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو (انکی) مہمانی کھولتا ہوا پانی ہے اور جہنم میں داخل کر دینا''

﴿سَلَامٌ لَّكَ﴾ والی آیت میں تین وجوہات

﴿فَسَلَامٌ لَّكَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ﴾ والی آیت میں تین وجوہات کا احتمال دیا گیا ہے پہلی وجہ (لَکَ کے بارے میں) یہ ہو کہ یہاں پر محتضر (مرنے والے سے خطاب ہو) اس لحاظ سے یہ معنی ہوگا اے اصحاب یمین (مرنے والے)

تجھ پر عذاب الٰہی سے سلامتی ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ﴿فَسَلَامٌ لَّكَ﴾ سے مراد بخشی والا ہے تو اس طرح سے معنٰی لیا جائے گا کہ اے وہ مومن جس نے اپنے آپ کو اصحاب یمین جیسا بنایا تجھ پر مرتے وقت تمام اصحاب یمین جو تجھ جیسے ہیں تجھ پر سلام بھیجتے ہیں اور وہ سب تجھ سے محبت کرتے ہیں۔

جیسا کہ معتبر روایات میں آیا ہے کہ جب کوئی مومن مرتا ہے تو مومنین اس کے پاس آتے ہیں اور احوال دنیا پوچھتے ہیں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا کیا حال ہے وہ کیسا ہے اگر وہ کہے کہ ابھی زندہ ہے اور دنیا میں ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ بعد میں ہم سے آکر ملحق ہو جائے گا اور اگر وہ مر گیا ہو تو وہ سب سمجھ جاتے ہیں کہ وہ (بُری جگہ گیا) اور ساقط ہو گیا ہے لہٰذا یہ سن کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ غرض جب اصحاب یمین میں سے کوئی مرتا ہے تو دوسرے ساتھی (اصحاب یمین میں سے) اس کے پاس آکر احوال پُرسی کرتے ہیں۔

اور چونکہ ان کا آپس میں ملنا خود ہی سلامتی کے ساتھ ہے اور ان میں آپس میں کوئی نزاع نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کی جگہ کا نام دارالسلام (وادی السلام) ہے[1] تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں پر (لک) سے مراد رسول خداؐ ہیں کہ اگر مرنے والا اصحاب یمین میں سے ہے تو اے پیغمبر آپؐ پر سلامتی ہو اور یہ سلام بھی اصحاب یمین کی طرف سے ہے کیونکہ جو بھی اچھا بنا اور اصحاب یمین میں قرار پایا وہ حضور کی برکت

---

(۱) معانی الاخبار

سے ایسا بنا اور جو بھی کسی مقام تک پہنچا وہ آپؐ ہی کی پیروی کرتے ہوئے پہنچا مقرب اور اصحاب یمین بن جانا آپؐ کے تابع ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یا اس وجہ سے کہ اصحاب یمین پیغمبرؐ کے پڑوسیوں میں سے ہوں گے اس لئے وہ سلام کرتے ہیں اور اس بناء پر کنایۃً اصحاب یمین کو حضرت محمدؐ کے پڑوسی ہونا بیان کیا جا رہا ہے۔

اوپر گزر جانے والی روایات میں جنت کی نعمتوں کو جو خود جنت سے بھی بڑھ کر ہیں تین چیزوں میں تقسیم کیا گیا ہے ان میں سے ایک نعمت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی آلؑ کا ہمسایہ مراد پانا ہے۔

پاک نفوس حضرت محمدؐ سے بہرہ مند ہیں

دوسرا بیان جو تیسری وجہ کے لئے کیا جاتا ہے ﴿فَسَلَامٌ لَّكَ﴾ کہ آپؐ پر سلام ہو (اے رسول گرامیؐ) اصحاب یمین کی جانب سے جیسا کہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے حضور کی ذات گرامی شجرۂ طیبہ ہے اور آپ کے جانشین (اور آل محمدؐ) اس درخت کی شاخیں ہیں اور آپ کے شیعہ انکے پتے ہیں جو کہ آپؐ کے تابع اور فرمانبردار ہیں اس وجہ سے اصحاب یمین کی سلامتی خود حضور کی سلامتی سے مربوط ہے اور اسی وجہ سے وہ ہر آفات سے محفوظ رہیں گے۔

دوزخ کا حمیم کافروں کے لئے ہے

﴿وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُكَذِّبِينَ ٱلضَّآلِّينَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ﴾

''اور اگر جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہیں تو انکی مہمانی کھولتا ہوا پانی

ہے اور جہنم میں داخل کر دینا۔"

اگر مرنے والا شقی اور قیامت کا منکر اور راہ حق سے گمراہ ہو تو اس کی پہلی تواضع دوزخ کی حمیم ہے، معتبر روایت میں ہے کہ کوئی مومن بغیر حوض کوثر کے چکھے دنیا سے نہیں جاتا اور کوئی کافر حمیم پئے بغیر اور اس کا مزہ چکھے بغیر نہیں مرتا۔(۱) جب کافر (کی روح) ستّر ہزار فرشتے لے جا رہے ہوں گے اور ان سب کے ہاتھوں میں آگ کے بنے ہوئے کوڑے ہوں گے اور اس کو شکنجے میں لے جا رہے ہوں گے اور وہ مسلسل واویلا کر رہا ہوگا۔ اور آخر میں ہم بحث کو ختم کرتے ہوئے امام علیؑ کی حدیث کو (جو لوگوں کے جان دینے کی کیفیت کے بارے میں ہے) بیان کرتے ہیں۔

موت بہشت کا یا دوزخ کا پیغام ہے

بحارالانوار میں حضرت امام جوادؑ خود اپنے پدر گرامی سے اور وہ خود حضرت امیرالمومنینؑ سے نقل کرتے ہیں کہ امام علیؑ عرض کیا کہ آپ مرگ (موت کے بارے میں کچھ بتائیں) امام علیؑ نے فرمایا تُو بہت آگاہ شخص کے پاس آیا ہے (یعنی میں موت سے بہت زیادہ آگاہ ہوں) آپ نے فرمایا کہ موت کی تین قسمیں ہیں مرنے والا شخص ہمیشہ آرام میں ہوگا یا اس کے لئے ہمیشہ عذاب ہوگا یا یہ شخص مبہم ہوگا (کہ نہیں معلوم کہ عذاب میں مبتلا ہوگا یا راحت و آرام میں ہوگا) وہ شخص جو ہمارا مطیع امر (یعنی اس سے واجب نہیں چھوٹتا اور حرام کا مرتکب نہیں ہوتا) (یہ ہمیشہ جنت میں ہوگا) لیکن

---

(۱) بحار الانوار جلد ۲

وہ شخص جو ہمارا مخالف ہے اس کے لئے ہمیشہ ہمیشہ عذاب ہے۔

ہاں اگر کوئی شخص ہمیں دوست رکھتا ہو لیکن اپنے پر بھی ظلم کرتا ہو اور توبہ کئے بغیر دنیا سے چلا گیا ہو تو اس کا امر مبہم ہوگا یعنی وہ پریشان اور سرگردان ہوگا جب تک کہ ہماری شفاعت نہ آجائے (۱) اس وقت امام علیؑ نے اپنے ماننے والوں کو تاکید فرمائی کہ مکمل کوشش کرو اور صرف اس بات پر اکتفاء نہ کرو کہ ہمارے محبّ ہو بلکہ عمل بھی لازم ہے۔

---

(۱) سفينة البحار جلد ۲

درس (۵۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ﴾

"بے شک یہ خبر یقیناً صحیح ہے تو (اے رسولؐ) تم اپنے بزرگ پروردگار کی تسبیح کرو۔"

اہل یقین عالم وجودی کا ثمر ہیں

یہ عالم وجودی ایمان کو پیدا کرنے کے لئے ہے دوسرے لفظوں میں مومن عالم وجود کا ثمرہ ہیں، کتاب شریف کافی میں ایک باب ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ اگر زمین پر ایک ہی مومن ہو تب بھی اس زمین کی خلقت کی غرض حاصل ہوگئی یعنی مومن اس قدر عزیز ہے۔

خداوند کریم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ خداوند کریم نے سات

آسمانوں کو اور زمین کو اس آسمان کی طرح پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو معلوم ہو جائے خداوند عالم ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں پروردگار نے ان آسمانوں اور زمینوں کی خلقت کی غرض کو بیان کیا ہے یعنی پروردگار نے ان زمینوں کو خلق فرمایا ہے تاکہ انسان پروردگار کے علم اور اس کی قدرت کو جان سکے اور اسے یقین حاصل ہو جائے پس اس عالم کا مقصد یہ ہے کہ اہل یقین پیدا ہو سکیں۔

جو شخص یقین کی منزلت تک پہنچ جائے اور اس میں کوئی تزلزل اور شک باقی نہ رہے اور وہ خدا کی وحدانیت کو مانتا ہو اور اس پر یقین رکھتا ہو، اور اسے اطمینان ہو کہ جنت اور دوزخ کا وجود ہے اور ذرہ برابر نیکی یا بدی کا بدلہ دیا جائے گا (۱) اگر چہ اسے نہ دیکھنا آتا ہو اور نہ پڑھنا آتا ہو کیونکہ یقین کا مطلب علم اصطلاحی نہیں ہے بلکہ قلب کے منور ہونے کا نام ہے جس میں کسی قسم کی تاریکی، شک وتردید اور شرک نہ ہو اسی وجہ سے اس کے حصول کے لئے روایات میں بہت زیادہ تاکید بیان ہوئی ہے جیسے علم حاصل کرو اگر چہ تمہیں چین جانا پڑے اس زمانے میں اسلامی نقاط سے دور ترین علاقہ چین کا تھا جس کی دوری میں مثال دیا کرتے تھے۔

دوسری روایت میں لوگوں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) ایک وہ جو اہل علم ہیں۔ (۲) یا علم حاصل کر رہے ہیں۔

---

(۱) ﴿و بالآخرة هم يوقنون﴾ سورہ بقرہ ۲ آیہ ۵

(۳) تیسرا گروہ پست اور ضایعہ ہے اہل علم سے مراد وہی اہل ایمان اور اہل یقین ہیں یا یہ یقین حاصل کر چکے ہوں گے یا حاصل کر رہے ہوں گے تیسری صورت میں یہ صرف سرگردان اور اپنی اپنی شہوات اور خواہشات کے پیچھے ہیں۔

غرض اہل یقین بہت ہی کم ہیں اگر کوئی ایک آدمی اہل یقین میں سے ہو تو اس کی وجہ سے بلائیں دور ہوتی ہیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں کیونکہ ایسے افراد کی وجہ سے عالم کو ایجاد کیا گیا ہے ایسے افراد کا ذکر ہم ذیل میں نمونے کے طور پر کر رہے ہیں۔

حضرت دانیالؑ کنویں میں شیر کے ساتھ

جناب حضرت دانیالؑ کے حالات زندگی میں ملتا ہے کہ بخت النصر نے حضرت دانیالؑ کو گرفتار کر لیا اور انہیں ایک گہرے کنویں کہ جس میں پہلے ہی سے ایک شیر کو ڈال چکا تھا، ڈال دیا اور کنویں کو بند کر دیا، اور یہ حکم دیا کہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کنویں کے نزدیک بھی جائے۔

ادھر خدا نے جبرائیلؑ کو وحی کی کہ فلاں مقام پر دانیالؑ کے لئے رزق لے کر جاؤ، جب جبرائیلؑ غذا لے کر کنویں تک پہنچے اور کنویں کا ڈھکنا ہٹایا تو دیکھا کہ ایک شیر حضرت دانیالؑ کے سامنے بڑے احترام کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے جبرائیلؑ نے جب دانیالؑ کو غذا پہنچائی تو دانیالؑ نے کہا۔

﴿الحمد الله الذی لا ینسی من شکره﴾

''تمام تعریفات اس خدا کے لئے کہ جو بھی اس کا شکر ادا کرے اسے وہ

فراموش نہیں کرتا''(۱)

اگر حضرت دانیالؑ کو خدا پر یقین نہ ہوتا تو شیر کے دیکھتے ہی ان کی جان نکل جاتی لیکن آپ اہل یقین میں سے تھے اور جانتے تھے کہ شیر بھی اللہ کی مخلوق میں سے ایک ہے اور یہ عاجز ہے اور یہ کوئی کام مشیت الٰہی کے بغیر نہیں کر سکتا۔

دنیا کی سختیاں یقین کے نور سے آسان ہو سکتی ہیں

آپ ۱۵؍شعبان کی دعا میں پڑھتے ہیں کہ خدا ہمیں یقین کا نور عطا فرما کہ جس کی برکت سے ہماری دنیاوی مشکلات آسان ہو جائیں (۲)

جب یقین کا نور مل جائے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ جو بھی اس کے لئے پیش آ رہا ہے یہ اس کی تقدیر ہے اور جو بھی اس کے مقدر میں ہے یہ اس کے لئے بہتر ہے یہ کہنا خود ہی دلوں کے آرام اور سکون کا باعث ہے اور اس کی وجہ سے دنیاوی مشکلات اسے آسان لگتی ہیں ناگفتہ نہ رہ جائے کہ دعا کا فقرہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایمان و یقین خدا کی طرف سے بخشش اور عطا ہے، کافی میں ایک مستقل باب بیان کیا گیا (باب فی الایمان موھبته من اللّٰه) کہ ایمان اللہ کی طرف سے ہے۔

البتہ انسان کو چاہئے کہ ایمان اور یقین کی دولت کو خداوند متعال سے طلب کرے۔

---

(۱) حیات القلوب ج ۱ ص ۲۶۳ (۲) ومن یقین ما یهون علینابه مصیبات الدنیا (دعائے نیمه شعبان

ایمان میں زیادتی کی قابلیت ہے

علماءِ کلام میں اس بات پر بہت زیادہ مباحثہ ہو چکے ہیں کہ کیا ایمان میں زیادتی اور کمی ہو سکتی ہے محققین کا کہنا ہے کہ ایمان میں زیادتی اور کمی ممکن ہے اور جو آیت اس سلسلے میں دلیل کے طور پر بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے (جب ان پر آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو انکا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے (۱)

یہ آیت بیان کرتی ہے کہ ایمان میں زیادہ ہونے کی صلاحیت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کم ہو جانے کی بھی صلاحیت موجود ہے۔

محقق طوسیؒ فرماتے ہیں: یقین کا تعلق دو چیزوں سے ہے، کسی چیز کے ہونے پر یقین اسی طرح کسی چیز کے نہ ہونے (عدم) پر یقین، یقین یعنی آشکار ہو جانا واضح ہو جانا، یہ مراتب اور درجات رکھتا ہے ایک عام آدمی کا ایمان اور سلمان فارسیؓ کے ایمان میں بہت فرق ہے اور ان حدیثوں کی بناء پر جو کہ آئمہ معصومینؑ سے نقل ہوئی ہیں اسی طرح صحیفۂ سجادیہ (صحیفہ کاملہ) کے مطابق پیغمبروں کے یقین کے بھی مراتب تھے۔

پیغمبروں کے یقین کے بھی درجات ہیں

رسول اکرمؐ سے عرض کی گئی کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم پانی پر چلتے تھے تو پیغمبر

---

(۱) ﴿فاذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا﴾ سورہ ۸ آیۃ ۲

نے فرمایا کہ اگر ان کا یقیناً زیادہ ہوتا تو ہوا پر بھی چلتے (۱) واقعی پیغمبر کا یقین کہاں اور حضرت عیسیٰ کا یقین کہاں؟

حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ پروردگار مجھے دکھا کہ تو کس طرح سے مردوں کو زندہ کرتا ہے تو انہیں کہا گیا کہ کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم نے کہا ایمان تو لایا ہوں لیکن اپنے دل کے اطمینان کی خاطر دیکھنا چاہتا ہوں (۲)

جب کہ امام علیؑ فرماتے ہیں کہ اگر پردے ہٹ جائیں پھر بھی میرے یقین میں فرق نہیں آئے گا اور کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوگا (۳) یہاں پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت علیؑ کے یقین میں کتنا فرق ہے۔

ہمارے بارہ امامؑ سب کے سب تمام انبیاء سے افضل ہیں سوائے رسول خداؐ کے اور شاید اس کی وجہ یقین ہی ہو۔ بالجملہ یقین کے مراتب ہیں جن میں کم اور زیادہ ہونے تغیر و تبدیل ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔

صبح کو ایک طرح اور ممکن ہے عصر کو کسی دوسری طرح کا ہو جائے کبھی کمال کی طرف جاتا ہے اور اس طرح کا ہو جاتا ہے کہ آخری عمر میں بھی کوئی شیطانی پھونک اسکے ایمان کے چراغ کو نہیں بجھا سکتی اور خدانخواستہ کسی کا ایمان نقص کی طرف بھی جا سکتا ہے۔

---

(۱) مصباح الشریعہ (۲) سورۂ بقرہ ۲/ آیۃ ۲۶۰ (۳) لو کشف الغطا ما ازددت یقینا

عملِ خیر ایمان کو زیادہ اور گناہوں کو کم کر دیتا ہے

وہ چیزیں جو یقین اور ایمان کے زیادتی کا سبب بنتی ہیں ان میں سے ایک خالص عبادت کرنا ہے خصوصاً اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا اسی طرح ہر وہ خالص عمل جس میں خدا کے علاوہ کسی سے توقع نہ رکھتا ہو اسی طرح، نماز، روزہ، ذکر قرآن، انفاق، قضاء حوائج غرض ہر عمل خیر نور ایمان کو تقویت پہنچاتا ہے۔

بالکل اس کے نقطہ مقابل گناہ ایمان کے نور کو ضعیف کر دیتا ہے بلکہ ہر مکروہ کام بھی ایمان کو ضعیف کر دیتا ہے بعض لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں اور اکثر اس بات کو محسوس نہیں کرتے اس مطلب کی تائید کے لئے ہم اصول کافی سے امام جعفر صادقؑ کی روایت نقل کر رہے ہیں۔

نور کا حضرت یوسفؑ کے ہاتھ سے نکل جانا

ہم جناب حضرت یوسفؑ کے قصے میں پڑھتے ہیں کہ جب حضرت یوسف نے اپنے والد اور اپنے بھائیوں کو مصر آنے کی دعوت دی، حضرت یعقوبؑ کو محمل میں بٹھا کر مصر لایا گیا حضرت یوسفؑ بھی اپنے والد کے استقبال کے لئے بعض معززین کے ہمراہ کچھ فرسخ تک آئے جب آپ اور آپ کے والد کی ملاقات ہوئی تو اصولاً حضرت یوسفؑ کو باپ کے احترام میں اپنی سواری سے نیچے اتر جانا چاہیے تھا لیکن یوسفؑ اپنی سواری سے نیچے نہ اترے اور یہی وہ مقام تھا کہ جہاں یوسفؑ سے

ترکِ اولی سرزد ہوا، اس وقت حضرت جبرائیل آئے اور عرض کی اے یوسفؑ آپ ذرا اپنی ہتھیلی کی طرف نگاہ کریں، آپؑ نے جب اپنی ہتھیلیوں کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ نورِ نبوت جو ان کے ہاتھوں میں تھا وہ نکل گیا جبرائیلؑ نے عرض کی کہ آپ نے ایک ترکِ اولی کیا یعنی آپ کو اپنے والد کے احترام میں نیچے اترنا چاہیے تھا لیکن آپ سواری سے نیچے نہ اترے اس وجہ سے آپ کے ہاتھوں سے نورِ نبوت نکل گیا اس بناء پر حضرت یوسفؑ کی نسل سے کوئی اور پیغمبرؑ نہ بنا۔ جب ترکِ اولی کا اتنا بڑا اثر ہو سکتا ہے تو پھر حرام اور مکروہ کام کا کتنا برا اثر ہوگا، ہر شخص کو اپنا حساب خود کرنا چاہئے کہ کہیں خدا نخواستہ اس کا ایمان ضعیف ہو چکا ہو اور زندگی کے آخری لمحات میں شیطان اس کو بھی ختم کر دے۔

اس مطلب کے دلیل کے لئے ہم قرآن کی سورہ روم کی آیت ۱۰ سے ایک آیت دلیل کے طور پر پیش کر رہے ہیں، کہ عاقبت ان کے لئے جو گناہ پہ گناہ کرتے ہیں اور یہ لوگ آیات اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں یعنی گناہ پہ گناہ کرنا اور توبہ نہ کرنا حقیقت میں بے ایمانی ہے۔ (یا امان الخائفین) اے اللہ تو ڈرنے والوں کے لئے امان ہے (یاذالمن و الامان) اے امان اور پناہ دینے والے۔

واقعی جب انسان آخرت کو یاد کرے تو اس کی کیا حالت ہونی چاہئے؟ آپ دعائے عدیلہ میں پڑھتے ہیں کہ اے خدا میں اپنے ایمان کو تیرے حوالے کرتا ہوں کہ تو مرتے وقت میری امانت میرے حوالے کر دے۔

(وانت خیر مستودع) جہاں پر درد ہو وہاں پر دوا بھی ہے، جہاں خوف ہو وہاں کوئی امان دینے والا بھی ہے اور یہ امن حقیقت میں اللہ کے کرم کا ظہور ہے لیکن افسوس اس کے طالب بہت ہی کم ہیں۔

﴿وتقبل انک انت السمیع العلیم۝﴾

مکتب اہلبیتؑ کی مطبوعات

۱۔ سجدہ گاہ

۲۔ آئینۂ حقیقت

۳۔ دُعائے کمیل

۴۔ فقہی اصطلاحات

۵۔ شیعہ عقیدہ ونظریات

۶۔ دینیات

۷۔ ہاتھی کا لشکر

۸۔ شہزادی ملیکہ

۹۔ گناہان کبیرہ جلد چہارم / ہفتم از آیت اللہ دستغیبؒ

۱۰۔ برزخ از آیت اللہ دستغیبؒ

۱۱۔ ایمان جلد اوّل از آیت اللہ دستغیبؒ

۱۲۔ ایمان جلد دوم از آیت اللہ دستغیبؒ (زیرِ طبع)

۱۳۔ خصائص حسینیہ خصوصیات امام حسینؑ حصہ اوّل (زیرِ طبع)

۱۴۔ خصائص حسینیہ خصوصیات امام حسینؑ حصہ دوم

۱۵۔ قلب سلیم آیت اللہ دستغیبؒ جلد دوم

۱۶۔ دارالاخرۃ جلد اوّل

ہماری مطبوعات بحق جامعۃ الزہراؑ اور مکتب اہل بیتؑ رضویہ سوسائٹی کراچی کی وقف خاص ہے۔